ویلنٹائن ڈے کی حقیقت اور تباہکاریاں

مسیحی سوالات مسلم جوابات

اکابرین کے اٹھتے جنازے اور ہماری ذمہ داریاں

Understanding the Old Testament Apocrypha
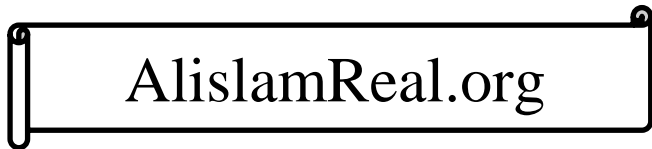
Love For The Sake of Allah & Hatred For The Sake of Allah الْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ

فہرست

English Portion

مغربی تہذیب نے بہت سے بے ہودہ رسوم ورواج کو جنم دیا اور بد تہذیبی اور بد کرداری کے نئے نئے طریقوں کو ایجاد کیا، جس کی لپیٹ میں اس وقت پوری دنیا ہے اور بطور خاص مسلم معاشرہ اس کی فتنہ سامانیوں کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ مختلف عنوانات سے دنوں کو منانے اور اس میں رنگ رلیاں رچانے کے کلچر کو فروغ دینا شروع کیا اور اس کی آڑ میں بہت سی خرافات، واہیات اور بد اخلاقی وبے حیائی کو پھیلانے لگے، چناں چہ ان ہی میں ایک 14 / فروری کی تاریخ ہے جس کو "یوم عاشقاں" یا "یوم محبت" کے نام سے منایا جاتا ہے اور تمام اخلاقی حدود کو پامال کیا جاتا ہے، بے حیائی اور بے شرمی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور تہذیب وشرافت کے خلاف کاموں کو انجام دیا جاتا ہے، ناجائز طور پر اظہار محبت کے لیے اس دن کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ چند سال قبل یہ لعنت اس درجہ ہمارے معاشرہ میں عام نہیں تھی، لیکن اب رفتہ رفتہ نوجوان طبقہ اس کا غیر معمولی اہتمام کرنے لگا ہے، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں زیر تعلیم طلباء وطالبات میں دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور گویا کہ یہ دن ان کے لیے دیگر تمام دنوں سے زیادہ اہمیت کا حامل بن گیا، کیوں کہ اس دن وہ اپنی آرزو کی تکمیل اور اپنے جذبات کا اظہار کرسکتے ہیں اور غیر شرعی وغیر اخلاقی طور پر محبت کا راگ الاپ سکتے ہیں، جب کہ شرعی اور اخلاقی، نیز معاشرتی اعتبار سے اس کی بہت ساری خرابیاں اور مفاسد ہیں، لیکن ان تمام کو بالائے طاق رکھ کر جوشِ جنون اور دیوانگی میں اس دن کو منانے کی فکروں میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ آیئے! اس کی حقیقت اور تاریخ کو جانتے ہیں تاکہ اس لعنت سے مسلم نوجوانوں کو بچایا جاسکے۔

ویلنٹائن ڈے کی حقیقت:

ویلنٹائن ڈے کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں، اس کی ابتدا کے لیے کئی ایک واقعات کو منسوب کیا جاتا ہے۔ جن میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ "سترہویں صدی عیسوی میں روم میں ویلنٹائن نام کا ایک پادری ایک راہبہ کی محبت میں مبتلا ہو گیا، چوں کہ عیسائیت میں راہبوں اور راہبات کے لیے نکاح ممنوع تھا، اس لیے ایک دن ویلنٹائن نے اپنی معشوقہ کی تشفی کے لیے اسے بتایا کہ اسے خواب میں یہ بتایا گیا کہ 14 / فروری کا دن ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی راہب یا راہبہ جسمانی تعلقات بھی قائم کرلیں تو اسے گناہ نہیں سمجھا جائے گا۔ راہبہ نے اس پر یقین کرلیا اور دونوں

سب کچھ کر گزرے۔ کلیسا کی روایات کی یوں دھجیاں اڑانے پر ان کا حشر وہی ہوا جو عموماً ہوا کرتا ہے۔ یعنی ان دونوں کو قتل کر دیا گیا، کچھ عرصے بعد چند لوگوں نے انہیں محبت کا شہید جان کر عقیدت کا اظہار کیا اور ان کی یاد میں یہ دن منانا شروع کر دیا۔

بعض کے نزدیک یہ وہ دن ہے جب سینٹ ویلنٹائن نے روزہ رکھا تھا اور لوگوں نے اسے محبت کا دیوتا مان کر یہ دن اسی کے نام کر دیا۔ کئی شرکیہ عقائد کے حامل لوگ اسے یونانی کیوپڈ (محبت کے دیوتا) اور وینس (حسن کی دیوی) سے موسوم کرتے ہیں، یہ لوگ کیوپڈ کو ویلنٹائن ڈے کا مرکزی کردار کہتے ہیں، جو اپنی محبت کے زہر بُجھے تیر نوجوان دلوں پر چلا کر انہیں گھائل کرتا تھا۔ تاریخی شواہد کے مطابق ویلنٹائن کے آغاز کے آثار قدیم رومن تہذیب کے عروج کے زمانے سے چلے آرہے ہیں[1]۔ اور بعض نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ: سینٹ ویلنٹائن ڈے کو آج کل جس طرح عاشقوں کے تہوار کے طور پر منایا جارہا ہے یا ویلنٹائن کارڈ بھیجنے کی جو نئی روایت چل پڑی ہے... اس کا سینٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق یا تو رومیوں کے دیوتا لوپر کالیا کے حوالہ سے پندرہ فروری کو منائے جانے والے تہوار بارآوری یا پرندوں کے ایامِ اختلاط سے ہے[2]۔ واقعہ بہر حال جو بھی ہو اور جس مقصد کے لیے بھی اس کا آغاز کیا گیا ہو، لیکن آج اس رسمِ بد نے ایک طوفان بے حیائی برپا کر دیا ہے، عفت و عصمت کی عظمت اور رشتۂ نکاح کے تقدس کو پامال کر دیا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں آزادی اور بے باکی کو پیدا کر دیا ہے، معاشرہ کو پراگندہ کرنے اور حیا و اخلاق کی تعلیمات کی دھجیاں اڑانے کی اور جنسی بے راہ روی کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، بر سر عام اظہار محبت کے نت نئے طریقوں کے ذریعہ شرم و حیا، ادب و شرافت کو ختم کر ڈالا، اس کی وجہ سے جو نہایت شرم ناک واقعات رونما ہو رہے ہیں اور تعلیم گاہوں اور جامعات میں جس قسم کی بے حیائی بڑھتی جارہی ہے اس کے لیے بعض قلم کاروں نے مستقل کتابیں لکھیں ہیں (اوپر حوالے میں جن کتابوں کے نام ہم نے پیش کیے ان کا مطالعہ بھی کافی ہے) تاکہ اس بے ہودگی سے نوجوان نسل کو روکا جاسکے۔

ویلنٹائن ڈے کی تباہیاں:

ویلنٹائن ڈے نے پاکیزہ معاشرہ کو بڑی بے دردی کے ساتھ بدامن اور داغ دار کیا ہے، اخلاقی قدروں کو تہس نہس کیا ہے، رشتوں، تعلقات اور احترام انسانیت تمام چیزوں کو پامال کیا ہے، لال گلاب اور سرخ رنگ اس کی خاص علامت ہے، پھول کی تقسیم اور اس موقع پر ویلنٹائن کارڈ کا تبادلہ بھی اظہارِ محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے، بڑے پیمانے پر اس کی تجارت ہوتی ہے اور ہوس پرست اس کو منہ بولے دام میں خریدتے ہیں۔ منچلوں کے لیے ایک مستقل تفریح کا سامان بن گیا۔ ویلنٹائن کی جھوٹی محبت کا انجام کیا ہوتا ہے اس کو مختصر جملوں میں بیان کیا ہے: عشق کا

---

[1] پادریوں کے کرتوت:285

[2] ویلنٹائن ڈے، تاریخ، حقائق اور اسلام کی نظر میں:40

بھوت نفرت میں بدل گیا، محبت کی شادی کا دردناک انجام، خاوند کے ہاتھوں محبوبہ کا قتل۔ عشق کی خاطر بہن نے بھائی کا قتل کر دیا۔ محبوب سمیت حوالات میں بند۔ محبت کی ناکامی پر دو بھائیوں نے خودکشی کرلی۔ محبت کی ناکامی... نوجوان ٹرین کے آگے کود گیا، جسم کے دو ٹکڑے۔ ناکام عاشق نے لڑکی کو والدین، چچا اور ایک بچی سمیت قتل کر ڈالا۔ یہ وہ اخباری سرخیاں ہیں جو نام نہاد محبت کی بنا پر معاشرتی المیہ بنیں اور آئے روز اخبارات کی زینت بنتی جارہی ہیں [1]۔

آخری بات:

یہ وہ تلخ حقائق اور ویلنٹائن ڈے کی تباہ کاریوں کی ایک مختصر روداد ہے، جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ویلنٹائن ڈے کے عنوان سے پوری دنیا میں کیا تباہی مچائی جاتی ہے اور کس طرح ایمان واخلاق سے کھیلا جاتا ہے، معاشرہ کو بے حیا بنانے اور نوجوانوں میں بے غیرتی اور بے حیائی کو فروغ دینے میں اس دن کی کیا تباہیاں ہیں؟ اس حقیقت سے کسی عقل مند اور سلیم المزاج انسان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس وقت پوری دنیا میں بے حیائی کو پھیلانے اور بدکاری کو عام کرنے کی منصوبہ بند کوششیں ہو رہی ہیں، نوجوانوں کو بے راہ کرنے اور بالخصوص مسلم نوجوانوں سے جذبۂ ایمانی کو کھرچنے اور حیا واخلاق کے جوہر سے محروم کر دینے کے یہ دن اور اس طرح کے بہت سے حربے اسلام دشمن طاقتیں استعمال کر رہی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو ان تمام لغویات اور واہیات قسم کی چیزوں سے بچنا ضروری ہے اور معاشرہ کو پاکیزہ بنانے اور اخلاق وکردار کو پروان چڑھانے کے لیے اس طرح کے بے حیائی کو فروغ دینے والے دنوں کا بائیکاٹ کرنا ضروری ہے اور اس کے بالمقابل اسلام کی حیا کی پاکیزہ تعلیمات کو عام کرنے، اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں کے ماحول میں بالخصوص اور نوجوان اپنے احباب اور دوستوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ اس دن کو بے حیائی کا دن اور بے حیائی کو عام کرنے کی ترغیب دینے کا دن بتانے کی کوشش کریں، ان تمام چیزوں سے اپنے آپ کو بچائیں جو کسی بھی اعتبار سے معاشرہ میں بے حیائی کے پھیلنے کا ذریعہ بنیں اور دنیا والوں کو اسلام کی بلند ترین تعلیمات کا خوب صورت نمونہ پیش کرنے والے بنیں۔

---

[1] ویلنٹائن ڈے، تاریخی حقائق اور اسلام کی نظر میں:119

قسط نمبر 7

قرآن پر ملحدین کے اعتراضات کا جائزہ

رحمت العالمین ﷺ اور ذنب کی استغفار کا حکم؟

دار التحقیقات انٹرنیشنل[1]

اعتراض:

ملحدین نے یہ دو آیات پیش کی ہیں کہ ایک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے رحمت بنا کے بھیجا اور دوسری آیت میں آپ ﷺ کو ذنب کے استغفار کا حکم دیا۔(اللہ معاف فرمائے ان لاعلمی کے بہتانوں سے)

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔

اور ہم نے تمہیں تمام جہانوں کیلیئے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا۔

سورۂ انبیاء آیت,107

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِىِّ وَالۡاِبۡكَارِ ۔

تو تم صبر کرو، بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنوں کے گناہوں کی معافی چاہو اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے صبح اور شام اس کی پاکی بولو۔

سورۂ غافر,55

---

[1] حافظ ابن جنید: متعلم درس نظامی

علامہ شعیب کراچی: فاضل علوم اسلامیہ

محمد شعیب احمد: علوم اسلامیہ سکالر

محمد شاہجہان اقبال: ایم فل علوم اسلامیہ

جواب:

سورۃ فتح کی ایک آیت اس معاملے کو سمجھنے کے لیے پیش خدمت ہے:

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۔[1]

''تاکہ اللہ تمہارے صدقے تمہارے اپنوں کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور اپنا انعام تم پر تمام کر دے اور تمہیں سیدھی راہ دکھادے۔ اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے۔''

یہاں بھی بہت سے لوگوں نے اس وجہ سے ٹھوکر کھائی کہ وہ ذنبک سے مراد آپ کے ذنب سمجھ بیٹھے، معاذ اللہ۔

بلکہ خود نفس عبارت گواہ ہے کہ یہ جسے ذنب فرمایا گیا ہرگز حقیقۃً ذنب بمعنی گناہ نہیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ یہ آپ صلی اللہ و اسلم کی طرف نسبت ہے تو ماتقدّم سے کیا مراد لیا، وحی اترنے سے پیشتر کے، اور گناہ کسے کہتے ہیں، مخالفتِ فرمان کو، اور فرمان کیا ہے سے معلوم ہوگا، وحی سے۔ تو جب تک وحی نہ اتری تھی فرمان کہاں تھا جب فرمان نہ تھا مخالفتِ فرمان کے کیا معنی، اور جب مخالفتِ فرمان نہیں تو گناہ کیا۔؟

جس طرح ماتقدم میں ثابت ہو لیا کہ حقیقۃً ذنب نہیں۔ یوں ہی ماتاخر میں نقد وقت ہے قبل ابتدائے نزول فرمان جو افعال جائز ہوئے کہ بعد کو فرمان ان کے منع پر اترا اور انہیں یوں تعبیر فرمایا گیا حالانکہ ان کا حقیقۃً گناہ ہونا کوئی معنی ہی نہ رکھتا تھا۔ یونہی بعد نزول وحی و ظہور رسالت بھی جو افعال جائز فرمائے اور بعد کو ان کی ممانعت اُتری اسی طریقے سے ان کو ماتاخر فرمایا کہ وحی بتدریج نازل ہوئی نہ کہ دفعۃً۔

اب جب کہ یہ نسبت آپ کی طرف ہے بقول معترض تو پھر یہ ذنب (گناہ) ثابت ہی نا ہو سکا تو پھر اس کی معنویت کیا رہ جاتی ہے۔ ان دونوں آیات میں پہلی جہاں "لذنبك" اور دوسری فتح کی آیت "ليغفر لك" واضح اشارہ ہے کہ آپ استغفار کیجیے مگر ان کے لیے جو آپ سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے معصیت میں زندگی گزاری اپنی جانوں پہ ظلم کیا۔ یہ بات کس حد تک ہمارے موقف کو صحت کے ساتھ دلیل بخشتی ہے آیئے اسے بھی دیکھ لیں۔

بلکہ آیت محمد ﷺ میں تو صاف قرینہ موجود ہے کہ خطاب حضور سے نہیں، اس کی ابتداء یوں ہے:

فاعلم انه لا اله الا الله واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنٰت

''جان لے کہ للہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنی اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی معافی چاہ۔''

---

[1] سورۃ فتح: 2,3

تو یہ خطاب اُس سے ہے جو ابھی لا الہ الا اللہ نہیں جانتا و گر نہ جاننے والے کو جاننے کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ اے سُننے والے جسے ابھی توحید پر یقین نہیں کسے باشد توحید پر یقین لا اور اپنے اور اپنے بھائی مسلمانوں کے گناہ کی معافی مانگ۔

اسی طرح ایک واضح آیت سورۃ النساء آپ کے سامنے رکھتا ہوں جو اس موقف کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دے گی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا[1]۔

"اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو اے حبیب! تمہاری بارگاہ میں حاضر ہو جاتے پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (بھی) ان کی مغفرت کی دعا فرماتے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، مہربان پاتے"۔

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح ہو گئی ایک یہ کہ کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا گیا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اب جب یہ بات جو نافہم اور ناعقل بیان کرنے کی لاحاصل کوشش میں ہیں کہ معاذاللہ رسول سے بھی ذنب (گناہ) سرزد ہو جاتا ہے تو پھر معصیت میں بھی اطاعت لازم ٹھہرے گی معاذاللہ یہ کیسی بے سندی بات ہے اور کیسا عظیم بہتان ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں کی طرف منسوب کر رہیں ہیں۔

دوسری بات کہ یہاں جو ظلم اور جو زیادتی آپ کے ماننے والوں سے ہوئی اس پہ اللہ نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے استغفار کا حکم دیا جو آیت سے واضح ہے۔

کیوں غلاموں کی نسبت آقا ہی کی طرف ہوتی ہے اس لیے انہیں کے گناہوں کی معافی کے لیے آپ کو حکم ہوا کہ آپ ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے یہاں آیت کو تھوڑا سا غور سے دیکھا جائے تو اللہ نے واضح فرمایا "جاءوك فاستغفروا الله" آپ کی بارگاہ میں آجائیں اور اللہ سے استغفار کریں۔ اب آگے کے ہی حصے کو ذرا دیکھے "واستغفر لهم الرسول" اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کریں۔ انبیاء علیہ السلام تو ہیں ہی معصوم عن الخطاء اور اس پہ امت کا اجماع ہے۔ انبیاء علیہ السلام تو ملائکہ سے بھی عظیم المرتبت ہیں اب فرشتوں سے معصیت کے متعلق سوچنا تو جہالت کے سواء کچھ نہیں مگر اس کے باوجود وہ بھی استغفار کرتے ہیں کس لیے اور کس کے لیے؟ آئیں اسے بھی قران سے ہی سمجھتے ہیں۔

---

[1] سورۂ نساء، 64

اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَ مَنۡ حَوۡلَہٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ رَبَّنَا وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَۃً وَّ عِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اتَّبَعُوۡا سَبِیۡلَکَ وَ قِہِمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ [1]

عرش اٹھانے والے اور اس کے ارد گرد موجود (فرشتے) اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی بخشش مانگتے ہیں۔ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر شے سے وسیع ہے تو انہیں بخش دے جو توبہ کریں اور تیرے راستے کی پیروی کریں اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

فرشتے بھی مومنین کے لیے استغفار کر رہیں ہیں جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ واسلم کو حکم ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں اللہ نے آپ صلی اللہ واسلم کو اپنی امت کے لیے استغفار کا حکم دیا۔ اور اگر کوئی ہٹ دھرمی سے پھر بھی نہیں باز آتا اور وہ یہی رٹ لگائے ہوئے کہ یہاں نسبت انہیں کی طرف ہے۔ تو پھر بھی وہ نرا جاہل ہے کہ کہ قران کے اسلوب اور عربی گرائمر سے نابلد وہ کیسے آئیں دیکھ لیں اس تناظر سے بھی " دونوں آیۃ کریمہ میں صیغہ امر ہے اور امر انشا ہے اور انشا وقوع پر دال نہیں تو حاصل اس قدر کہ بفرض وقوع استغفار واجب نہ یہ کہ معاذ اللہ واقع ہوا، جیسے کسی سے کہنا اکرم ضیفك اپنے مہمان کی عزت کرنا، اس سے یہ مراد نہیں کہ اس وقت کوئی مہمان موجود ہے نہ یہ خبر ہے کہ خواہی نخواہی کوئی مہمان آئے گا ہی بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ اگر ایسا ہو تو یوں کرنا۔"

آئیں اس بات کو مزید ایک اور زاویے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو علماء نے سمجھائی جو خالصتاً عربی زبان کو سمجھے بغیر ممکن نہ تھا مگر معترضین کو تو اردو ٹھیک نہیں آتی خیر اس زاویے کو بھی دیکھ لیں۔

علم کی دنیا کا ایک مسلمہ قاعدہ اور اصول ہے:

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال

جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے۔

سورہ مومن و سورہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آیات کریمہ میں کون سی دلیل قطعی ہے۔ کہ خطاب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے، مومن میں تو اتنا ہے:

واستغفر لذنبك-

اے شخص اپنی خطا کی معافی چاہ کسی کا خاص نام نہیں کوئی دلیل تخصیص کلام نہیں۔

قرآن عظیم تمام جہاں کی ہدایت کے لیے اترا نہ صرف اس وقت کے موجودین بلکہ قیامت تک کے آنے والوں سے وہ خطاب فرماتا ہے،

---

[1] سورۃ غافر، 7

(اقیموا الصلوۃ) نماز برپا رکھو۔ یہ خطاب جیسا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تھا ویسا ہی ہم سے بھی ہے اور تا قیامِ قیامت ہمارے بعد آنے والی نسلوں سے بھی۔

اسی قرآن عظیم میں ہے:

اس کے علاوہ میں ایک اور تناظر بھی آپ کے سامنے رکھوں گا وہ تقریباً زبانوں میں پایا جاتا ہے عربی لیے لے، انگلش دیکھ لیں، فارسی اٹھالیں، یا اپنی زبان اردو ہی لے لیجے، اردو کی علم البیان کی کتب میں یہ درج ہے کہ ایک صنعت پائی جاتی ہے جسے "حسنِ تعلیل" کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی شے کی کوئی علت بیان کرنا اس کی بے شمار اقسام۔ ہیں میں طوالت کے ڈر سے ان میں سے صرف ایک کو بیان کرتا ہوں اور وہ ہے "جز کو بول کر کل مراد لینا" اب اس اعتبار سے بھی آپ کلامِ مجید کے اسلوب کو دیکھے تو بات روزِ روشن کی طرح ہو جاتی ہے۔ کہ یہاں اصل نسبت کا محمول کون ہیں جیسا کہ اوپر کی تمام بحث سے عیاں ہو گیا ہے۔ اس لیے ان دو آیات میں تعارض اور تضاد موجود نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ارادی اختیار کے طور پہ جب بھی کوئی اپنے اختیار کا استعمال کرتا ہے تو اس فعل پہ جزاء و سزاء وارد ہوتی ہے۔ اس کے متعلق اعتراض نمبر 5 میں اس کی مکمل بحث ہے وہاں سے ملاحظہ فرمالیں۔[1]

التوفیق الا باللہ

---

[1] الاسلام ریئل: دسمبر 2020

مطالعہ سیرتِ رسول ﷺ کی ضرورت واہمیت

ابو المتبسّم ایاز احمد عطاری

سرکار دوعالم "صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم" کی ولادت مبارکہ سے پہلے عرب کی حالت بد سے بدتر تھی۔ جہالت کے اندھیروں میں وہ غرق تھے۔ جہالت ہی نے بُت پرستی جنم دی تھی۔ بُت پرستی کی لعنت نے ان کے انسانی دل و دماغ پر قابض ہو کر ان کو توہم پرست بنا دیا تھا۔ یہ لوگ پتھر، چاند، ستارے، سورج اور آگ وغیرہ کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے پتھروں کی عبادت کرتے تھے۔ اسی کو اپنا رازق مانتے تھے۔ ہر چیز کا خالق انہی بُتوں کو سمجھتے تھے۔

ان کے عقائد تو دن بدن بگڑتے جارہے تھے لیکن عقائد کے ساتھ ساتھ ان کے افعال واعمال بھی بے حد خراب ہوتے جارہے تھے۔ قتل و غارت گری، شراب نوشی، جوّا، زناکاری، لواطت، عورتوں کو زندہ دفن کرنا، فُحش گوئی، گالی گلوچ، بداخلاقی، الغرض کون سا ایسا گندہ فعل تھا؟ جو ان میں نہ تھا. ان کو جہالت سے نکالنے کیلئے اللہ عزوجل نے اپنے پیارے بندے "حضرت محمد" (صلی اللہ تعالی علیہ وسلم) کو پیدا فرما کر اس امتِ مسلمہ پر احسانِ عظیم فرمایا۔

ایسی ہستی کو اللہ عزوجل نے پیدا فرمایا کہ جنہوں نے ان کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر روشنی کا راستہ دیکھایا۔ بُت پرستی سے نکال کر معبودِ حقیقی کی طرف دعوت دی۔ جنہوں نے اس دعوت کو قبول کیا وہ شخص کامیاب وکامران ہو گیا. اور جنہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا وہ ناکام ہو گیے۔ اب بھی جو شخص کامیاب ہونا چاہ رہا ہے وہ ایسی ذات کا محتاج ہے جو کامل و اکمل ہو۔ وہ ذات حضور (صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس ہے۔

یہ ایسی ذات ہے جن کہ بارے میں ایک عاشق لکھتے ہیں:

ؔ"وہ کمالِ حسن حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں"

آقا دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے کمال کا حسن عطا فرمایا ہے کہ آپ کے حسن میں عیب تو کیا عیب عیب کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کا وہ کونسا پھول ہے جس کے ساتھ کانٹا نہ ہو۔ مگر مدینے کا پھول ہر قسم کے کانٹے سے محفوظ اور ہر طرح کا کانٹا آپ سے دور ہے اور ہر شمع کے ساتھ دھوئیں کا ہونا لازم ہے۔ لیکن آپ ایسی شمع رسالت ہیں کہ جہاں دھوئیں کا نام ونشان نہیں ہے۔

اس شعر میں حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ والیہ وسلم کے حسن کی رعنائیوں کو بیان کیا گیا۔ جس کو صحابہ کرام علیھم الرضوان یوں بیان کرتے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ جیسا حسین وجمیل نہ آپ سے پہلے دیکھا نہ آپ کے بعد کوئی دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ نے خود کئی مواقع پہ فرمایا کہ تم میں کون میری طرح ہو سکتا ہے۔ (شرح حدائق بخشش)

لہذا!! اس ذات کی سیرت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم دنیا و آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں۔ ورنہ اس ذات کے سوائے کامیابی کیلئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے واقفیت بے حد ضروری اور لازم ہے۔

سیرت رسول کی ضرورت پر تو بہت سارے دلائل ہیں۔ لیکن میں صرف "6" دلائل بیان کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں۔

1. انسان کے وجود کی اصلاح کا ایک اہم ترین طریقہ یہ بھی ہے:

کسی ایسی شخصیت کو پیش کیا جائے جن کا ہر قول وفعل انسان کی اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔

یہ کمالِ صرف وصرف حضور (صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم) کی ذات میں ہے۔ جس شخص نے اِن کی سیرت کو اپنالیا۔ اُس کا سر فخر سے بلند ہے کہ انہوں نے اپنے آقا ومولی (صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کو اپنالیا ہے۔ ورنہ پھر دونوں جہانوں میں رسوائی مقدر بنے گی۔

2. ہر انسان سکون وچین کا متلاشی رہتا ہے۔ اور سکون پانے کیلئے ایک اہم وکامل طریقہ یہ ہے کہ انسان نبی پاک ﷺ کی ذات سے وابستہ ہو جائے۔ اور وابستہ ہونے کیلئے اُس شخصیت کی سیرت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ تاکہ بندہ اس شخصیت کی سیرت پہ گامزن ہو کر سکون وچین پا سکے۔ حقیقت یہی ہے کہ جس نے بھی اس ذات کی سیرت کی پیروی کی ہے وہ بندہ چین وسکون میں ہے۔

3. حضور ﷺ کی ذات ہدایت ونجات پانے کا ذریعہ ہے۔ تو اس کی سیرت کو اپنانا ضروری ہے۔ تاکہ اس ذات کی خصوصی نظرِ کرم ہو۔ اب جس قدر بندہ اس ذات کی سیرت کو زیادہ اپنانے کی کوشش کرے گا اسی قدر اس ذات کی خصوصی نظر کرم اس بندے پہ ہو گی۔

4. اللہ عزوجل نے قرآن پاک میں حضور ﷺ کی سیرت کو مسلمانوں کیلئے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

قولہ تعالی کا فرمان ہے: " لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ " بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی مقدس ذات میں زندگی کا حسین ترین نمونہ ہے۔

5. انہی کی سیرت کی پیروی میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کو ترقی کا راز پوشیدہ رکھا ہے۔ ان کی سیرت کی پیروی کے بغیر ترقی نہ ملی ہے نہ ملے گی۔ (لیکن افسوس کہ انسان ترقی کا راز کسی اور جگہ تلاش کر رہا ہے)
6. اگر مسلمان اغیار کی غلامی سے آزادی چاہتے ہیں تو سرکار ﷺ کی غلامی اختیار کریں۔ اور تمام افعال واقوال میں آپ کی اتباع کریں۔

جس معاشرے اور ادارے میں سیرت کی اہمیت نہیں ہے وہ معاشرہ وادارہ ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا۔ جی ہاں:: بالکل ایسا ہی ہے جس نے بھی اس ذات کی سیرت کو اہمیت نہ دی وہ کبھی بھی ترقی نہیں پا سکتا۔ اگر آپ کو ترقی چاہیے تو اس ذات کے دامن سے وابستہ ہو جا۔ لہذا!! سیرتِ رسول کو اپنے اپر لازم کر لو۔ اِنۡ شَاءَاللہ عَزَّوَجَلَّ آپ اس دنیا واُس دنیا میں کامیابی سے ہم کنار ہونگے۔

سلسلہ: فتنہ انکارِ حدیث

قسط نمبر 1

تعارف منکرین حدیث

مولانا رانا محمد عاطف[1]

منکرینِ حدیث کے متعلق پیشین گوئی:

قربان جائیں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر، کہ اپنی امت کے لیے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا، جس سے امت کا واسطہ پڑنا ہو اور وہ آپ نے بیان نہ کر دیا ہو۔

جھوٹے مدعیانِ نبوت ہوں، فتنوں کی نمائش ہو، شرق وغرب کی جنگیں ہوں، یا مسلمانوں کی خستہ حالی اور آزمائش ہو۔ ہر پہلو کے متعلق ہمارے محبوب ہمیں آگاہی دے چکے ہیں۔

آج سوشل میڈیا کے پردوں کے پیچھے، بند کمروں میں صوفوں پر تکیہ لگائے ہوئے کچھ لوگ انکارِ حدیث کا فتنہ پھیلا رہے ہیں ان کے متعلق بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمادی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَى أَرِيكَتِهِ يَقُولُ: عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ، أَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ لَحْمُ الْحِمَارِ الْأَهْلِيِّ وَلَا كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السَّبُعِ۔[2]

ترجمہ: یاد رکھو، بے شک مجھے قرآن اور اس جیسا کلام (احادیث) اس کے ساتھ دیا گیا ہے، سن لو، قریب ہے کہ پیٹ بھر کے کھانے والا کوئی شخص اپنی آراستہ تکیہ دار چوکی (صوفے وغیرہ) پر بیٹھ کر کہے کہ تمہارے لیے بس یہ قرآن کافی ہے، لہذا تم اس میں جو حلال پاؤ، اسے حلال

---

[1] مولانا رانا محمد عاطف بنوری ٹاؤن: فاضل علوم اسلامیہ

[2] صحیح أبي داود: الصفحة أو الرقم: 4604

سمجھو اور تم اس میں جو حرام پاؤ، اسے حرام سمجھو۔ یاد رکھو! تمہارے لیے پالتو گدھے کا گوشت حلال نہیں ہے، اور نہ درندے تمہارے لیے حلال ہیں۔

منکرینِ حدیث کی ابتداء:

1۔ سب سے پہلے اسلامی تاریخ میں انکارِ حدیث کی ابتداء خوارج نے کی۔ یہ دور پہلی صدی کا تھا، خوارج وہ گروہ تھا جنھوں نے قرآن مجید کی تعبیر و تشریح میں حدیث و سنت کے بجائے اپنی رائے پر اعتماد کیا۔ وہ دور چونکہ صحابہ کرام کا عظیم دور تھا، اس لیے ان ہستیوں کی موجودگی میں یہ فتنہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔

2۔ پھر پہلی صدی ہجری کے آخر میں معتزلہ کا ظہور ہوا، جنھوں نے فتنہ انکارِ سنت کو ایک منظّم تحریک کی شکل دیدی۔ معتزلہ کے دماغوں پر یونانی فکر وفلسفہ اور عقل کا غلبہ تھا، اس لیے انہوں نے ایسی بہت سے احادیث کا انکار کردیا، جن میں ما بعد الطبعیاتی مسائل (Metaphysical issues) یا ایسے امور کا بیان ہے جن کی کوئی عقلی توجیہ کرنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح ان لوگوں نے قرآن مجید کی ان تمام آیات کی بھی تاویل کرڈالی جن کو ان کی عقلیں سمجھنے سے قاصر تھیں۔

علمائے امت و محدثین نے اس فتنہ کی سرکوبی میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا۔ لیکن چونکہ معتزلہ کو ریاستی سرپرستی حاصل تھی، عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے دور سے لے کر واثق باللہ کے دور تک انہیں عروج حاصل رہا۔ اس دور میں علمائے حق کو شدید مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ واثق باللہ کے بھائی متوکل باللہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی معتزلہ کا زوال شروع ہوگیا۔

اور پھر تیسری صدی ہجری کے بعد ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

3۔ وقت گزرتا گیا، یہاں تک سترہویں صدی عیسوی میں یونانی فلسفے نے مغربی فکر وفلسفہ کے روپ میں نیا جنم لیا۔ یہ وہ دور تھا جب عالمِ اسلام بدقسمتی سے علمی وفکری جمود کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنے انحطاط کے آخری مراحل بڑی تیزی سے طے کررہا تھا۔

مغرب نے سیاسی میدان میں مسلمانوں کو ہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد ان میں یونانی فکر وفلسفہ کو سرایت کرنا چاہا، مگر اسلامی سوسائٹی میں وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔

4۔ اس مرحلے کے بعد مغرب نے اپنے طریقِ کار میں تبدیلی کردی، اور تحریکِ استشراق کا رخ اس طرف کردیا کہ مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اصلاحِ مذہب اور اسلام کی جدید تعبیر پر زور دے کر مسلمانوں کو ان کے دین سے بیزار کیا جائے۔

یہ اٹھارویں صدی کے اخیر اور انیسوی صدی عیسوی کی ابتداء کا دور تھا، مغرب کے اس طریق کار نے اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مستشرقین نے اسلامی فکر کے بنیادی ماخذ قرآن وسنت کو براہِ راست اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

مستشرقین کا دور:

یہ انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی دور تھا، مستشرقین میں سے

أ. ڈاکٹر اسپرنسر نے تین جلدوں میں سیرت پر کتاب لکھی، تو اس میں حدیث کی روایت اور اس کی حیثیت پر بھی تنقید کی۔

ب. ولیم میور نے سیرت پر اپنی کتاب میں حدیث پر اس بحث کو مزید آگے بڑھایا۔

ت. مشہور جرمن مستشرق گولڈ زیہر نے اپنی کتاب میں سب سے زیادہ تفصیل کی، اور اپنی کتاب کی دوسری جلد میں حدیث پر تجزیاتی انداز میں تنقید کی۔

بعد کے دور کے تمام مستشرقین گولڈ زیہر کے اصولوں کے مطابق آگے بڑھے۔

ث. پروفیسر الفرڈ گیلیوم نے اپنی کتاب میں گولڈ زیہر کی ہی تحقیق کو آگے بڑھایا۔

ج. جوزف شاخت نے اپنی کتاب میں گولڈ زیہر کے اصولوں کی روشنی میں اسلامی قانون کے مصادر اور منابع پر تجزیہ کیا، اور حدیث کی نبوی حیثیت کو مشکوک قرار دیا۔

ان کے علاوہ "مار گولیتھ، رابسن، گِب، وِل ڈیورانٹ، آرتھر جیفری، منٹگمری واٹ، ہوروفیتش، وان کریمر، کیتانی اور نکلسن جیسے مستشرقین نے اپنے حدیث مخالف نظریات پیش کئے۔

ایک طرف ان مستشرقین کے رد میں علمائے امت نے دن رات ایک کر ڈالے۔ تو دوسری طرف جدیدیت پسند اور مغربی فکر و فلسفہ سے ذہنی مرعوبیت کا شکار کچھ نام نہاد مسلمان ان مستشرقین کے مشن کو لے کر آگے بڑھے۔

برّ صغیر میں فتنہ انکارِ حدیث کی ابتداء:

برّ صغیر میں فتنہ انکارِ سنت کی تحریک کو سب سے پہلے سر سید احمد خان نے بنیادیں فراہم کیں۔

سر سید کے بعد ان کے رفیقِ کار مولوی چراغ علی / فرقہ اہلِ قرآن کے بانی مولوی عبد اللہ چکڑالوی / خواجہ احمد الدین امر تسری / مستری محمد رمضان گوجرانوالہ / حافظ محمد اسلم جیراج پوری / علامہ عنایت اللہ المشرقی / نیاز فتح پوری / تمنا عمادی / ڈاکٹر غلام جیلانی برق / غلام احمد پرویز / ڈاکٹر فضل الرحمن / جعفر شاہ پھلواروی / حبیب الرحمن کاندھلوی / عمر احمد عثمانی / محبوب شاہ گوجرانوالہ / مولوی محب الحق عظیم

آبادی / قمر الدین قمر / حشمت علی لاہوری / خدا بخش / سید عمر شاہ گجراتی / سید رفیع الدین ملتانی اور سید مقبول احمد وغیرہ نے مستشرقین کے مشن کو آگے بڑھایا۔

یہ وہ نمایاں شخصیات ہیں، جنہوں نے حجیتِ حدیث کی عمارت کو زمیں بوس کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

ان میں غلام احمد پرویز وہ ہے جس نے انکارِ حدیث کے فتنے کو مزید منظم کیا، بے شمار کتابیں اور تفسیریں اپنے اسی مقصد کے پرچار کے لیے لکھ ماری۔ اس نے اپنی لچھے دار تحریروں اور انشاء پردازی کے سحر سے تعلیم یافتہ اور بالخصوص نوجوان طبقہ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔

انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے منکرینِ حدیث کا ٹولہ آج جاوید غامدی اور محمد شیخ کی صورت میں موجود ہے۔

پاکستان میں موجود منکرینِ حدیث:

خوارج اور معتزلہ سے انکارِ حدیث کا سلسلہ چلتا ہوا مستشرقین تک پہنچا، مستشرقین سے ہوتا ہوا برّصغیر پہنچا، برّصغیر میں سر سید احمد اور غلام احمد پرویز سے ہوتا ہوا آج پاکستان میں بھی موجود ہے۔ پاکستان میں اس وقت دو اسکالر بہت زور و شور سے اپنے باطل نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

ایک: جاوید احمد غامدی

دوسرا: محمد شی

1 جاوید احمد غامدی:

جاوید غامدی نے کھل کر کلی طور پر انکارِ حدیث کا اگرچہ دعوی نہیں کیا، بلکہ بعض تحریروں میں حجیتِ سنت پر دلائل بھی دئے ہیں، لیکن اس نے اپنی کتابوں میں جو عقائد لکھیں ہیں، وہ متواتر اور صحیح احادیث سے ٹکراتے ہیں، ظاہر ہے احادیث کی حجیت کو تسلیم کرنے والا سنت سے ثابت ہونے والے اجماعی عقائد کا انکار بھی نہیں کر سکتا۔

مثلاً جاوید غامدی کے مندرجہ ذیل عقائد ہیں:

- عیسی علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔[1]

---

[1] میزان حصہ اول ص22 ط1985

- خروجِ دجال کا انکار۔[1]
- زکاۃ کا نصاب جو شریعت نے مقرر کیا ہے، وہ ضروری نہیں، ریاست بھی نصاب مقرر کر سکتی ہے۔[2]
- قتل خطا میں دیت کا حکم مستقل اور ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔[3]
- شادی شدہ زانی مرد یا عورت کے لیے رجم کی سزا کا انکار۔[4]
- مرتد کے لیے قتل کی سزا نہیں ہے۔[5]

یہ اور ان جیسے بے شمار ایسے عقائد ہیں غامدی صاحب کے جو نصوصِ قطعیہ احادیثِ رسول اللہ، اور اجماعِ امت سے ہٹ کر ہیں۔

اس لیے جاوید غامدی کے بارے میں یہ کہنا "کہ انہوں نے حجیتِ احادیث پر اور اسلام کے مضبوط عقائد کی بنیادوں پر کاری ضربیں لگانے کی کوشش کی ہے" بے دلیل نہیں۔

2 محمد شیخ:

دوسرا مشہور اسکالر کھلم کھلا منکرِ حدیث آج کل محمد شیخ نامی ایک شخص ہے، جو کہ کراچی کا رہائشی ہے۔

یہ شخص بظاہر پچھلے تمام منکرینِ حدیث سے چند قدم آگے نکل گیا ہے، اس لیے کہ اس نے جو دعوے کئے ہیں، وہ آج تک کسی منکرِ حدیث نے کھل کر نہیں کئے:

مثلاً:

- قرآن مجید ہم پر نازل ہوا۔(نزول کے معنے میں تحریف کرکے)
- ہمیں جبریل علیہ السلام قرآن مجید سکھاتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ اشراق شمارہ جنوری 1996 ص 61

[2] میزان 353 ط سوم 2008

[3] برہان ص 18 ط 2006

[4] میزان ص 624 ط سوم 2008

[5] برہان ص 143 ط چہارم 2006

- قرآن بنی اسرائیل پر نازل ہوا۔ (امتِ محمدیہ کو بنی اسرائیل بنا کر)
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی نہیں ہیں۔ (کیونکہ قرآن میں آخر کا لفظ نہیں آیا)
- مسجدِ نبوی میں روضہ رسول نہیں ہے۔
- قرآن میں اللہ نے عقل چلانے کا اختیار دیا ہے۔ (لہذا اپنی مرضی سے جو چاہے مطلب نکال لو)
- آسمانی معراج کا واقعہ من گھڑت ہے (کیونکہ المسجد الاقصی سے مراد مسجدِ نبوی ہے)
- قرآن میں جہاں جہاں بھی مسجد کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد لنگر خانہ ہے۔
- نماز روزہ زکاۃ حج، یہ تمام عبادتیں اس طرح نہیں، جس طرح مسلمانوں میں چلی آرہی ہیں۔[1]

اس کے علاوہ بے شمار عجیب وغریب کفریہ نظریات ہیں۔

ان ساری باتوں کے ثبوت اس کی ویڈیوز میں موجود ہیں، اگر کسی ساتھی کو چاہیے ہوں تو وہ ان ویڈیوز کے لنک مانگ سکتا ہے، ایک لنک نیچے دے دیا گیا ہے۔[2]

یہ شیخی فتنہ بہت تیزی سے ماڈرن لوگوں میں سرایت کر رہا ہے۔ خاص کر اس مکالمے کے بعد جو اس نے مفتی عبد الباقی سے کیا، اور اس کی ریکارڈنگ کروا کر اس کی تشہیر شروع کر دی، چونکہ مفتی عبد الباقی کو ان کی ذہنیت کا اندازہ نہیں تھا، وہ ان سے عام مکالمہ کرنے چلے گئے، لیکن جب وہاں جا کر ان کے عجیب وغریب نظریات سنے تو حیران رہ گئے۔ ان کی اسی حیرانگی والی ویڈیوز کے ٹکڑے بعد میں ان لوگوں نے مشہور کر کے محمد شیخ کو اچھالنا شروع کر دیا۔ جبکہ اس کے بعد سینکڑوں علماء نے (جن میں مولانا منظور مینگل صاحب بھی ہیں) محمد شیخ کو مناظرے کا چیلنج دیا، لیکن اس میں چیلنج قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب وہ اور اس کے چیلے سوشل میڈیا کے پردوں کے پیچھے اپنے باطل نظریات کا پرچار کر رہا ہے۔

اللہ تعالی اس بدبخت سے پاکستان کی سرزمین کو پاک فرمائے۔ آمین

---

[1] محمد شیخ نامی شخص کے دعوی جات کے اصل دیکھنے کے لیے "الاسلام ریئل" کی ٹیم سے رابطہ فرمائیں

[2] https://www.facebook.com/groups/426604344712262/permalink/577511276288234/

منکرینِ حدیث کے مختلف نظریات:

آج کے دور میں اگر آپ کا واسطہ کسی منکرِ حدیث سے پڑے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ ہر منکرِ حدیث کا ایک الگ نظریہ ہے، حالانکہ خود کو قرآنسٹ کہنے والے ایک قرآن پر عمل کرنے کا دعوی کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں بھی آپس میں اتفاق نہیں ہے۔

ان سے بات کرتے وقت آپ کو اندازہ ہو گا کہ ایک عجیب و غریب پاگل خانہ ہے جس کا نام ہے "انکارِ حدیث" اور یہ منکرینِ حدیث اس پاگل خانے کے سر گرداں پاگل ہیں۔

قرآن کے ہر ہر لفظ میں ہر منکرِ حدیث نے اپنی مرضی سے ایک مطلب نکالا ہوا ہے۔

لفظِ "مسجد": قرآن میں بے شمار مقامات پر استعمال ہوا ہے، ایک اس سے "لنگر خانہ" مراد لیتا ہے، دوسرا اس سے "قرآن" مراد لیتا ہے، تیسرا اس سے "میٹنگ روم" مراد لیتا ہے، چوتھا اس سے "عبادت گاہ" مراد لیتا ہے۔

لفظِ "صلاۃ": ایک اس سے ملاقات مراد لیتا ہے، تو پانچوں نمازوں کا انکار کر دیتا ہے، کہ قرآن میں اس مروجہ نماز کا ثبوت نہیں ہے۔

دوسرا اس سے درسِ قرآن مراد لیتا ہے، صلاۃ الفجر کو قرآن الفجر پر قیاس کر دیتا ہے، کہ صلاۃ سے مراد دو ٹائم درسِ قرآن ہے۔

تیسرا اس سے نماز مراد لیتا ہے، لیکن کہتا ہے کہ پانچ نمازیں نہیں دو نمازے ہیں، کیونکہ قرآن میں صلاۃ الفجر اور صلاۃ العشاء کا ذکر آیا ہے۔

چوتھا اس سے تین نمازیں مراد لیتا ہے فجر عشاء ظہر، کیونکہ قرآن میں آیا ہے: حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطی۔

یعنی جتنے منہ، اتنی باتیں۔

منکرین حدیث سے گفتگو کا احوال:

میری اب تک نو، دس منکرینِ حدیث سے گفتگو ہوئی ہے، جن کا خلاصہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

ایک دفعہ میں نے منکرینِ حدیث سے سوال کیا:

قرآن آپ تک کیسے پہنچا؟

اب اس آسان سوال کے عجیب و غریب جوابات ملاحظہ فرمائیں:

1۔ ایک نے جواب دیا "اللہ تعالی نے پہنچایا ہے" اور ساتھ ہی آیت پیش کر دی "انا انزلناہ قرآنا عربیا"۔

اب اس آیت کا اس جواب سے کیا تعلق ؟ میں نے پوچھا: نازل تو اللہ تعالی نے کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، مگر ہم تک کیسے پہنچا، کس سبب سے پہنچا؟ تو آگے سے جواب آیا تمہارا قرآن پر ایمان ہی نہیں۔

شاباش

چلیں دوسرے منکرِ حدیث کے جواب کی طرف:

2۔ دوسرے نے جواب دیا "نزول کا مطلب آسمان سے اترنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے "سمجھ میں آنا"، لہذا قرآن ہم سمجھتے ہیں، تو گویا یہ ہم پر نازل ہوتا ہے"۔

میں نے پوچھا: نزول کا یہ مطلب آپ نے کہاں سے لیا؟ جواب ملا: قرآن میں غور کر کے معلوم ہوا۔ میں نے پوچھا: قرآن کی عربی سمجھتے ہو؟ جواب ملا: عربی ضروری نہیں، کومن سینس ہونا ضروری ہے؟ میں نے پوچھا: انگریزوں میں سے کسی انگریز میں کومن سینس ہے یا نہیں، اگر نہیں تو کیسے؟ اگر ہے تو آج تک کوئی انگریز بغیر عربی پڑھے، بغیر ترجمے کی مدد لئے صرف کومن سینس سے قرآن کو کیوں نہیں سمجھا؟ جواب ملا: "ومن یکفر بآیات اللہ فانہ سریع الحساب"۔ میں نے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ یہ کومن سینس ہوتا کیا ہے؟ جواب ملا: "ومن یکفر بآیات اللہ فانہ سریع الحساب"۔ میں نے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ کہ قرآن کی کس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے عربی کی ضرورت نہیں، کومن سینس کی ضرورت ہے؟ جواب ملا: "ومن یکفر بآیات اللہ فانہ سریع الحساب"۔

شاباش

چلیں اب تیسرے منکرِ حدیث کا جواب سنیں:

3۔ تیسرے منکرِ حدیث نے کہا کہ قرآن ہمیں انسانی ذریعے سے پہنچا ہے۔ میں نے پوچھا: وہ انسانی ذریعہ کونسا ہے؟ جواب ملا: صحابہ پھر تابعین پھر تبع تابعین پھر یہی سلسلہ چلتا آیا۔ میں نے پوچھا: اسی انسانی ذریعے سے تو احادیث بھی ہم تک پہنچی ہیں، تو پھر آپ نے احادیث کیوں نہیں مانی؟ جواب ملا: ہم تک انسانی ذریعے سے جو کچھ پہنچا اسے ہم نے لیبارٹری میں ٹیسٹ کیا، جو حق لگا اسے لے لیا، جو ناحق لگا اسے چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا: یہ لیبارٹری کونسی ہے، جس میں آپ نے ٹیسٹ کیا؟ کہنے لگا کہ کائنات لیبارٹری ہے۔ یعنی قرآن اور حدیث کو ہم کائنات پر فِٹ کریں گے، جو کائنات پر صادق آگئی وہ سچ ہے، جو صادق نہ آئی وہ جھوٹ ہے۔ میں نے پوچھا: اچھا تم نے کون کونسی حدیثیں اس طرح لیبارٹری میں ٹیسٹ کی ہیں جو تمہیں کائنات کے موافق نہ لگیں تو تم نے چھوڑ دیں۔ جواب ندارد۔

پھر ہمارے ایک ساتھی ذبیح اللہ نے اس سے پوچھا: کہ میں نے قرآن کو تمہاری انسانی کائناتی لیبارٹری میں ٹیسٹ کیا، تو مجھے لیبارٹری نے منفی جواب دیا، وہ اس طرح کہ قرآن میں اللہ تعالی فرماتا ہے "ان اللہ عندہ علم الساعۃ ویںزل الغیث ویعلم ما فی الارحام" اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ ہے، مذکر یا مؤنث وہ اللہ کے علم میں ہے۔ میں نے جب اسے کائنات کی لیبارٹری میں ٹیسٹ کیا تو

جواب ملا کہ یہ علم تو آج کل الٹرا ساؤنڈ کی مدد سے انسانوں کو بھی ہو جاتا ہے۔ تو یہ قرآن کے خلاف کائنات میں ایک چیز مل گئی، اب اس کا کیا ہو گا قرآن کی اس آیت کا انکار کر دیں؟

پھر اس کا جو جواب اُس منکرِ حدیث نے دیا، وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

منکرینِ حدیث کے مختلف نظریات:

بات چل رہی تھی لیبارٹری میں ٹیسٹ کرنے کی، تو ہم نے ایک منکرِ حدیث سے جب پوچھا کہ قرآن کی یہ آیت "**ویعلم ما فی الارحام**" کائنات کی لیبارٹری میں ہم نے ٹیسٹ کی تو نتیجہ منفی آیا ہے، کائنات کی جدید سائنس یہ بتا رہی ہے کہ یا تو یہ آیت جھوٹی ہے (العیاذ باللہ)، یا کائنات جھوٹی ہے؟

تو ان صاحب نے کافی دیر کی ہیر پھیر کے بعد جواب دیا کہ "**یعلم ما فی الارحام**" کے الفاظ پر غور کرو خود ہی سمجھ جاؤ گے۔

میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ کہنے لگا: دیکھو اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ جو کچھ ارحام میں ہوتا ہے، وہ اللہ جانتا ہے، لیکن اس بات کی نفی تو نہیں کی گئی نا کہ اللہ تعالی کے علاوہ کوئی اور نہیں جان سکتا، یعنی اس آیت میں علم کی تخصیص اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔ **(لا حول ولا قوۃ)**

میں نے کہا: اچھا، اس کا مطلب قرآن میں جہاں بھی علم کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے ان سب میں اختصاص نہیں، "**ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون، ما تفعلوا من خیر یعلمه اللہ، واللہ یعلم وانتم لا تعلمون، واللہ یعلم المفسد من المصلح**" ایسی بے شمار آیتیں ہیں، ان تمام آیتوں میں اگر علم کو اللہ تعالی کے ساتھ خاص نہ کیا جائے تو تحریف کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی کی صفت میں غیر اللہ کا شریک بنانا لازم آجائے گا. العیاذباللہ

پھر عجیب بات کہ اللہ تعالی نے اسی **علم ما فی الارحام** کے متعلق ایک دوسری آیت میں تخصیص بھی فرمائی ہے، لفظِ "**الا**" سے، ارشادِ باری تعالی ہے: "**وما تحمل من انثی ولا تضع الا بعلمه**"۔ اب اس آیت کا کیا جواب ہے؟ تو اس آیت کا کیا جواب ہوتا، سوائے خاموشی کے۔

قارئینِ کرام یہ المیہ ہے انکارِ حدیث کا۔ منکرینِ حدیث عام مسلمانوں کو قرآن کے نام پر گمراہ کر رہے ہیں، چونکہ قرآن ہر مسلمان کے لئے عظیم کتاب ہے، تو اس نام سے بہت سے سادہ لوح مسلمان غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں. اور جب انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، لیکن اس میں من مانیاں کرنا، نفس پرستی سے غلط مطلب بیان کرنا، تحریفیں کرنا ان منکرینِ حدیث کا شیوہ ہے، تو مسلمانوں کے سامنے ان کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

منکرینِ حدیث کا پہلا نظریہ:

وحی صرف متلو ہے، غیر متلو کوئی چیز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن وحی کیا گیا ہے، اور کچھ نہیں۔

اس نظریے کا رد:

منکرینِ حدیث کے اس نظریے کی خود قرآن کریم کی بے شمار آیتیں تردید کر رہی ہیں۔

(1) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ. [1]

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وحی کی تین قسمیں ہیں، اللہ تعالی بشر سے کلام کرتا ہے 1

۔ دل میں بات ڈال کر

2۔ پردے کے پیچھے سے

3۔ قاصد (فرشتہ) بھیج کر

قرآن مجید وحی کی ان تین قسموں میں سے تیسری قسم ہے، اس لیے کہ اللہ تعالی نے اس بات کا بیان خود سورۃ الشعراء میں فرمایا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ [2]

باقی رہ گئی وحی کی پہلی دو قسمیں، دل میں بات ڈالنا، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنا۔

وحی کی پہلی قسم: دل میں بات ڈالنا، یہ احادیث کی صورت میں موجود ہے۔

وحی کی دوسری قسم: پردے کے پیچھے سے بات کرنا، یہ معراج کے موقع پر ہوا۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تین طریقے سے وحی کی گئی تھی:

ایک: فرشتے کے ذریعے، جو قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے۔

دوم: دل میں بات ڈال کر، جو کہ احادیث کی صورت میں موجود ہے۔

سوم: معراج کے موقع پر۔

اس آیت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کی گئی ہے۔

منکرینِ حدیث کے پاس اس آیت کا کوئی جواب نہیں، سوائے ہیر پھیر کے۔

---

[1] الشوری 51

[2] الشعراء 193

منکرینِ حدیث کا یہ جو نظریہ ہے، اسے وہ بعینہ ان الفاظ میں بیان کرنے سے ہچکچاتے ہیں، حقیقت میں یہی دعوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز وحی نہیں کی گئی، لیکن انہیں معلوم ہے کہ ہمارے اس دعوے کے خلاف قرآن مجید کی بے شمار آیتیں موجود ہیں۔ اس لیے منکرینِ حدیث الفاظ کچھ اور استعمال کرتے ہیں۔

ان کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

"اللہ تعالی نے قرآن کے بعد رسول اللہ پر کوئی اور کتاب نازل نہیں کی"۔

اب ظاہر سی بات ہے، بظاہر تو ان کے یہ الفاظ قابلِ گرفت نہیں، کیونکہ کتاب تو قرآن ہی نازل ہوئی ہے، لیکن ان الفاظ کی آڑ میں نظریہ ان کا یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ احادیثِ رسول کی کوئی حیثیت نہیں، اور آج جو بخاری و مسلم کی صورت میں احادیث کا جو ذخیرہ موجود ہے، وہ نعوذ باللہ من گھڑت ہے۔

ایک منکرِ حدیث سے اسی سلسلے میں ایک دلچسپ مکالمہ:

ابو محمد نامی منکرِ حدیث بار بار شور کرتا تھا کہ میرے سوال کا جواب آج تک مجھے کوئی نہیں دے سکا۔ اور یہ وہ شخص تھا جس سے کچھ عرصہ پہلے میری قرآن مجید کے لفظِ **"اسر"** پر گفتگو ہوئی تھی، اور وہ لاجواب ہو گیا تھا. اس کے بعد سے اس نے یہ دوسرا حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے اس شخص کو کہا کہ تمہارے کس سوال کا جواب تمہیں نہیں مل رہا، مجھے بتاؤ، اس نے کہا میرے ساتھ مکمل گفتگو کرو، موضوع متعین کریں گے، تم اپنا دعوی پیش کرنا، میں اپنا دعوی پیش کروں گا۔ میں نے کہا چلو وقت متعین کر لو، وہ چونکہ تیاری کر چکا تھا، اس لیے بولا: ابھی شروع ہو جاؤ، میں نے شام کا وقت لیا، لیکن وہ تیار نہ ہوا، تو میں نے حامی بھر لی۔

اس نے موضوع کو عنوان دیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا وحی کیا گیا؟"

پھر دعوی پیش کیا: "اللہ تعالی نے قرآن کے بعد رسول اللہ پر کوئی اور کتاب نازل نہیں کی"۔

یہ وہی الفاظ تھے۔

میں نے اس سے وضاحت طلب کی کہ کیا آپ کے دعوے کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں کی گئی؟ بولا: میں نے یہ الفاظ نہیں کہے۔ میں نے کہا: تو کیا مطلب ہے آپ کے دعوے کا؟ بولا: غور سے دو تین دفعہ سن لو۔ میں نے کہا: سن لیا، میں تو یہی مطلب سمجھ رہا ہوں، اگر غلط سمجھ رہا ہوں تو کہہ دو غلط ہے، اور صحیح مطلب بیان کر دو۔ بولا: تم مجھے الفاظ میں پھنسانا چاہ رہے ہو۔ میں نے کہا: اس میں پھسانا کہاں آ گیا، جو مطلب ہے، تم بتا دو۔ اگر تم الفاظ سے ڈر رہے ہو، تو میں آپ سے سوال کے انداز میں پوچھ لیتا ہوں کہ کیا انبیاء پر صرف

کتابی صورت میں وحی کی جاتی تھی، یا کتاب کے علاوہ بھی وحی ہو سکتی تھی؟ کہنے لگا: تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔ میں نے کہا: میں تو آپ کے دعوے کی وضاحت چاہ رہا ہوں، موضوع سے کب ہٹا؟ کہنے لگا: اپنا دعوی پیش کرو۔ میں نے کہا: آپ کا دعوی واضح ہو جائے گا تو میری باری آئے گی نا؟

بہر حال اس نے اس وضاحت کا اقرار نہیں کیا۔ حالانکہ نظریہ اس کا یہی تھا، لیکن وہ تیاری اس بات پر کر کے آیا تھا کہ میں ان سے بخاری اور مسلم کے متعلق قرآن کی آیت مانگوں گا، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ میرا مقصد یہ پہلے سے سمجھ چکے ہیں۔

میں نے پھر اس سے مزید وضاحت پوچھی، میں نے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ وحی کیا ہوتا ہے، اور وحی کی کتنی قسمیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں؟ کہنے لگا: دیکھا میں پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے میری بات کا جواب کوئی نہیں دے سکتا، یہ دیکھو لوگو! عاطف رانا بھی موضوع سے ہٹ رہا ہے، میں کہہ رہا ہوں دعوی بیان کرو مگر وہ بیان نہیں کر رہا، یہ گمراہ لوگ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا: محترم: میں آپ کے دعوے سے آگے گیا ہی نہیں، میں آپ سے دعوے کی وضاحت طلب کر رہا ہوں، تو وضاحت کر دو، آخر آپ کو پریشانی کیا ہے؟ کیا آپ کا یہ دعوی نہیں کہ قرآن کے علاوہ رسول اللہ پر اور کوئی وحی نہیں کی گئی؟ چلو اگر آپ کو وحی کا معنہ اور قسمیں نہیں معلوم تو میں قرآن سے بیان کر دیتا ہوں۔ کر دوں؟ بولا: میری آپ سے وحی کے متعلق بات نہیں ہوئی تھی کہ میں نے آپ کو پڑھانا ہے یا سکھانا ہے۔ میں نے کہا: محترم: اپنے دعوے کی وضاحت تو کرنی ہے نا آپ نے، یا یہ وضاحت بھی متعین کرنی ضروری تھی۔

خلاصہ کلام یہ کہ نہ اس نے اس وضاحت کو مانا، نہ وحی کا معنہ اور قسمیں بتائیں۔ اور یوں ہی بات ختم ہو گئی۔

یہ ہے ان منکرینِ حدیث کا دجل، الفاظ کے پیچ و خم میں لوگوں کو الجھا کر اپنا باطل نظریہ پیش کرتے ہیں، نام قرآن کا لیتے ہیں۔ اور حقیقت میں اسی قرآن کے منکر ہیں۔

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

"آیت نمبر1"

قادیانی قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے باطل استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امت محمدیہ ﷺ میں قرب قیامت ایک اور نیا رسول قادیان میں پیدا ہو گا۔ اور وہ لوگوں کی اصلاح کرے گا۔
آیئے پہلے آیات اور اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں پھر قادیانیوں کے باطل استدلال کا علمی رد کرتے ہیں۔

آیات:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍۙ۔ وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔[2]

آیت کا ترجمہ:

وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کریں اور ان کو پاکیزہ بنایئں اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں۔ اور ان میں سے کچھ اور بھی ہیں جو ابھی آکر ان سے نہیں ملے۔ وہ بڑے اقتدار والا بڑی حکمت والا ہے۔

---

[1] مفتی سعد کامران: ایم فل سکالر۔ فاضل علوم اسلامیہ۔ مصنف کتب کثیرہ

[2] الشعراء193

قادیانیوں کا باطل استدلال:

قادیانی قرآن مجید کی اس آیت سے باطل استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امت محمدیہؐ میں قرب قیامت ایک اور نیا رسول قادیان میں پیدا ہو گا۔ اور وہ لوگوں کی اصلاح کرے گا۔

قادیانیوں کے اس باطل استدلال کے بہت سے جوابات ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

جواب نمبر 1:

اگر اس آیت کی تفسیر "تفسیر القرآن بالقرآن" دیکھیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے:

یہ آیت کریمہ دراصل اس دعا کا جواب ہے جو حضرت ابراھیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے مانگی تھی۔ وہ دعا یہ ہے۔

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ"[1]

ہمارے پروردگار! ان میں سے ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو۔ جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاکیزہ بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اس دعا کو قبول کرتے ہوئے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا جیسا کہ زیر بحث آیت میں ذکر ہے۔

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"[2]

وہی ہے جس امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کریں اور ان کو پاکیزہ بنائیں اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں۔

مبعوث تو آپ ﷺ عرب کے لوگوں میں ہوئے لیکن آپ ﷺ ہادی وبرحق اور نبی ورسول قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک کی اور آیات سے بھی ظاہر ہے۔

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا"[3]

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت نمبر 129

[2] سورۃ الجمعہ آیت نمبر 2

[3] سورۃ الاعراف آیت نمبر 158

اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا گیا رسول ہوں۔

پس چونکہ آپ ﷺ قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے رسول ہیں لہذا آپ کے زمانہ نبوت میں کسی نئے رسول یا نبی کی کوئی گنجائش نہیں۔

جواب نمبر2:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: "كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَأُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْجُمُعَةِ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ، قَالَ: قُلْتُ: مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَلَمْ يُرَاجِعْهُ حَتَّى سَأَلَ ثَلَاثًا، وَفِينَا سَلْمَانُ الْفَارِسِيُّ ؓ، وَضَعَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَدَهُ عَلَى سَلْمَانَ، ثُمَّ قَالَ: "لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ أَوْ رَجُلٌ مِنْ هَؤُلَاءِ۔"[1]

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ ﷺ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی۔ "وآخرین منھم لما یلحقو بھم "تو میں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ وہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ حتی کہ تیسری بار سوال عرض کرنے پر آپ ﷺ نے ہم میں بیٹھے ہوئے سلمان فارسیؓ پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا گیا تو یہ لوگ (اہل فارس) اس کو پالیں گے۔"

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل فارس کی ایک جماعت ہو گی جو اسلام کی تقویت کا باعث بنے گی۔

چنانچہ اس حدیث کے مصداق عجم و فارس میں بڑے بڑے محدثین، فقہاء، مفسرین، مجددین، صوفیاء اور اولیاء کرام پیدا ہوئے ہیں۔ جو اسلام کی تقویت کا باعث بنے ہیں۔ اس حدیث نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ آپ ﷺ ہر حاضر اور غائب کے نبی ہیں اور قیامت تک جتنے بھی لوگ آئیں گے آپ ﷺ ان سب کے نبی ہوں گے۔ مزید کسی نئے نبی کی گنجائش نہیں۔

جواب نمبر3:

امام رازیؒ جو مرزا قادیانی سے پہلے کے مفسر ہیں اور مرزا صاحب نے ان کو عسل مصفی میں چھٹی صدی کا مجدد بھی تسلیم کیا ہوا ہے وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

[1] بخاری حدیث نمبر 4897، کتاب التفسیر، باب یاتی من بعدی اسمہ احمد، مسلم حدیث نمبر 6498، ترمذی حدیث نمبر 3310

ابن عباسؓ اور مفسرین کی جماعت کہتی ہے کہ آخرین سے مراد عجمی ہیں (یعنی آپ ﷺ عرب و عجم کے لئے معلم و نبی ہیں) مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے تابعین مراد ہیں۔

سب اقوال کا حاصل یہ ہے کہ امیین سے عرب مراد ہیں اور آخرین سے مراد وہ تمام اقوام ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوں گی۔[1]

لیجئے مرزا صاحب کے تسلیم کئے گئے مفسرین کے مطابق اس آیت سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوں گے آپ ﷺ ان تمام لوگوں کے نبی ہیں۔

جواب نمبر 4:

اس آیت کے بارے میں جو کچھ مرزا صاحب نے لکھا ہے مرزا صاحب اس کے مطابق بھی نبی ثابت نہیں ہوتے بلکہ "کذاب" ثابت ہوتے ہیں۔

آیئے مرزا صاحب کی اس تحریر کا جائزہ لیتے ہیں جو مرزا صاحب نے زیر بحث آیت کے متعلق لکھی ہے۔

مرزا صاحب نے لکھا ہے:

"خدا وہ ہے جس نے امیوں میں سے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب اور حکمت سکھلاتا ہے اگرچہ پہلے وہ صریح گمراہ تھے۔ اور ایسا ہی وہ رسول جو ان کی تربیت کر رہا ہے ایک دوسرے کی بھی تربیت کرے گا جو انہی میں سے ہو جائیں گے۔ گویا تمام آیت معہ اپنے الفاظ مقدرہ یوں ہے۔

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ"

یعنی ہمارے خالص اور کامل بندے بجز صحابہ کرامؓ کے اور بھی ہیں۔ جن کا گروہ کثیر آخری زمانہ میں پیدا ہو گا۔ اور جیسے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت فرمائی۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ اس گروہ کی بھی باطنی طور پر تربیت فرمائیں گے۔[2]

مرزا صاحب کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں۔

1) اخیر زمانہ میں ایک گروہ کثیر پیدا ہو گا۔

---

[1] تفسیر کبیر جلد 3 صفحہ 4

[2] آیئنہ کمالات اسلام صفحہ 209، 208 مندرجہ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 209، 208

2)　وہ گروہ خالص اور کامل بندوں پر مشتمل ہو گا۔

3)　اس گروہ کی باطنی طور پر تربیت خود آپ ﷺ فرمائیں گے۔

لیجئے مرزا صاحب کی تحریر کے مطابق بھی آخرین کی تربیت خود حضور ﷺ فرمائیں گے۔

نہ کہ کوئی ایسا شخص جو قادیان میں پیدا ہوا اور خود کو نبی اور رسول کہتا ہو۔

خلاصہ:

پس ثابت ہوا کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے نبی ہیں۔ اب نہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔

آیت نمبر 2:

قادیانی قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے باطل استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرامؑ سے اور خود رسول اللہ ﷺ سے یہ عہد لیا تھا کہ سب انبیاء اور رسولوں کے بعد ایک رسول آئے گا۔ اور تمام انبیاء کرامؑ کی زندگی میں اگر وہ رسول آگیا تو تمام انبیاء کرامؑ کو اس کی تصدیق اور مدد کرنی پڑے گی۔ قادیانی کہتے ہیں کہ جس رسول کے آنے کی بات اس آیت میں ہو رہی ہے اس سے مراد نعوذ باللہ مرزا قادیانی ہے۔

آیئے پہلے آیات اور اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں پھر قادیانیوں کے باطل استدلال کا علمی رد کرتے ہیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ [1]

اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ: اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے، اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا کہ: کیا تم

---

[1] سورۃ آل عمران آیت نمبر 81

اس بات کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا: ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: تو پھر (ایک دوسرے کے اقرار کے) گواہ بن جاؤ، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی میں شامل ہوں۔

اس کے علاوہ درج ذیل آیت بھی ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا [1]

اور (اے پیغمبر) وہ وقت یاد رکھو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا اور تم سے بھی، اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ اور ہم نے ان سے نہایت پختہ عہد لیا تھا۔

قادیانیوں کے اس باطل استدلال کے بہت سے جوابات ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب نمبر:1

اس آیت کی تفسیر خود مرزا قادیانی نے لکھی ہے اور اس تفسیر میں مرزا قادیانی نے آنے والے رسول سے مراد حضور ﷺ کو لیا ہے۔

مرزا قادیانی نے لکھا ہے:

"اور یاد کر جب خدا نے تمام رسولوں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دوں گا۔ اور پھر تمہارے پاس آخری زمانے میں میرا رسول آئے گا جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے گا۔ تمہیں اس پر ایمان لانا ہو گا۔ اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔ اب ظاہر ہے کہ انبیاءؑ تو اپنے اپنے وقت پر فوت ہو گئے تھے۔ یہ حکم ہر نبیؑ کی امت کے لئے ہے۔ کہ جب وہ رسول ظاہر ہو تو اس پر ایمان لاو۔ اب بتایئں میاں عبد الحکیم خان نیم ملاخطرہ ایمان! کہ اگر صرف توحید خشک سے نجات ہو سکتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ ایسے لوگوں سے کیوں مؤاخذہ کرے گا جو گو آنحضرت ﷺ پر ایمان نہیں لاتے مگر توحید باری تعالیٰ کے قائل ہیں۔ [2]

جب خود مرزا قادیانی نے اس آیت کی تفسیر میں آنے والے نبی سے مراد "محمد ﷺ" کو لیا ہے۔ تو پھر قادیانیوں کی تاویل تو خود ہی باطل ہو جاتی ہے۔

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت نمبر 7

[2] حقیقۃ الوحی صفحہ 131، 130 مندرجہ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 134، 133

جواب نمبر2:

مرزا صاحب سے پہلے کے تمام مفسرین کرام نے اس آیت میں "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" سے مراد حضور ﷺ کی ذات اقدس کو لیا ہے۔
حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے۔

"مابعث الله نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق لئن بعث الله محمدا وهو حی لیئومنن به ولینصرنه وآمره ان یاخذ المیثاق علی امته لئن بعث محمد وهم احیاء لیئومنن به ولینصرنه"

اللہ تعالیٰ نے جس نبیؑ کو بھی مبعوث فرمایا اس سے یہ عہد لیا کہ اگر تمہاری زندگی میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا تو ان پر ضرور ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ اس طرح اللہ نے ہر اس نبیؑ کو حکم دیا کہ آپ اپنی امت سے پختہ عہد لیں۔ کہ اگر اس امت کے ہوتے ہوئے وہ نبی (آخر الزماں ﷺ) تشریف لے آئیں تو وہ امت ضرور ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرے۔ [1]

جواب نمبر3:

قادیانی کہتے ہیں کہ اس آیت میں رسول کا لفظ نکرہ ہے۔ تو اس سے کیسے معرفہ مراد ہو سکتی ہے؟؟ اسکا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خود نکرہ کو معرفہ بنا کر اس کی تخصیص کر دی ہے۔
اس کے علاوہ درج ذیل آیات میں بھی رسول کا لفظ نکرہ ہے۔

- ✓ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا [2]
- ✓ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا [3]
- ✓ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ [4]

اگر ان آیات میں نکرہ میں تخصیص کر کے رسول کو معرفہ بنایا جا سکتا ہے تو ہماری زیر بحث آیت میں رسول کو معرفہ کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟؟

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ 177، جامع البیان صفحہ 55

[2] الجمعہ آیت نمبر 4

[3] البقرۃ آیت نمبر 129

[4] التوبہ آیت 128

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہماری زیر بحث آیت میں جس نبی کے آنے کے بارے میں تمام انبیاء کرامؑ سے وعدہ لیا جارہا ہے۔ وہ نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اس بات کو 14 صدیوں کے تمام مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔ اور خود مرزا قادیانی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔
پس ثابت ہوا کہ قادیانیوں کی تاویل باطل ہے۔

آیت نمبر 3:

قادیانی اجرائے نبوت کے موضوع پر قرآن مجید کی ایک اور آیت پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں ذکر ہے کہ ایمان والوں کی ایک نشانی بیان ہوئی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے بعد آنے والے نبی پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس پتہ چلا کہ حضور ﷺ کے بعد بھی نبی آسکتے ہیں۔
آیئے پہلے آیت اور اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں اور پھر قادیانیوں کے باطل استدلال کا علمی رد کرتے ہیں۔

آیت:

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"

"ترجمہ"
"اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں"

جواب نمبر 1:

اس آیت میں حضور ﷺ کے بعد کسی نئے نبی پر ایمان لانے کا بیان نہیں ہو رہا بلکہ قیامت کے دن پر ایمان لانے کا بیان ہو رہا ہے۔
اس کی دلیل یہ ہے کی اگر اس آیت کی تفسیر القرآن بالقرآن کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن پر ایمان کو اس آیت میں بیان کیا جارہا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیت ہماری زیر بحث آیت کی تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔
"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ"

"اور حقیقت یہ ہے کہ دار آخرت ہی اصل زندگی ہے"
اس آیت سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ آخرت سے مراد قیامت اور قیامت کے بعد کی زندگی ہے۔

جواب نمبر2:

قرآن پاک میں 50 سے زائد مرتبہ آخرت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ آخرت کے لفظ سے قیامت اور قیامت کے بعد کی زندگی مراد ہے۔ لہذا قرآن کے اسلوب کے مطابق ہماری زیر بحث آیت میں بھی قیامت اور قیامت کے بعد یعنی آخرت کی زندگی مراد ہے۔

جواب نمبر3:

اس آیت سے مرزا قادیانی نے بھی آخرت کی زندگی مراد لی ہے۔

مرزا قادیانی نے لکھا ہے:

"طالب نجات وہ ہے جو خاتم النبیین پیغمبر آخر الزمان ﷺ پر جو کچھ اتارا گیا اس پر ایمان لائے۔ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ۔ اور طالب نجات وہ ہے جو پچھلی آنے والی گھڑی یعنی قیامت پر یقین رکھے اور جزا اور سزا کو مانتا ہو"[1]

مندرجہ بالا حوالے میں مرزا قادیانی نے خود تسلیم کیا ہے کہ آخرت سے مراد قیامت اور قیامت کے بعد کی زندگی ہے۔ لہذا قادیانیوں کا باطل استدلال ان کے گرو مرزا قادیانی کے نزدیک بھی باطل ہے۔

جواب نمبر4:

قادیانیوں کے پہلے خلیفہ حکیم نورالدین نے بھی آخرت سے مراد آخرت کی گھڑی لی ہے۔[2]

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قادیانیوں کا اس آیت سے کیا گیا استدلال خود مرزا قادیانی اور حکیم نورالدین کے نزدیک بھی باطل ہے اور آخرت سے مراد قیامت اور قیامت کے بعد کی زندگی ہے۔

---

[1] تفسیر مرزا غلام احمد قادیانی جلد2 صفحہ 75، الحکم 10 اکتوبر 1904ء

[2] البدر 4 فروری 1909ء

آیت نمبر4:

"ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا"[1]

"یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ اس نے جو نعمت کسی قوم کو دی ہو۔"

قادیانی اس آیت سے باطل استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبوت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔اور امت محمدیہ ﷺ اس نبوت والی نعمت سے کیوں محروم ہو سکتی ہے۔

قادیانیوں کے اس باطل استدلال کے بہت سے جوابات ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

جواب نمبر1:

جس طرح نبوت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اسی طرح شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔پس اگر قادیانیوں کے نزدیک شریعت والی نعمت ختم ہو سکتی ہے تو بغیر شریعت کے نعمت کیوں ختم نہیں ہو سکتی۔

(یادرہے قادیانی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد شریعت والا نبی نہیں آسکتا)

جواب نمبر2:

اگر نبوت کو قادیانی نعمت سمجھتے ہیں تو پھر اس نعمت کو مرزا قادیانی کے بعد بھی جاری رہنا چاہیے تھا حالانکہ قادیانی مرزا قادیانی کے بعد نبوت کو بند سمجھتے ہیں۔اگر قادیانیوں کے نزدیک نبوت نعمت ہے تو مرزا قادیانی کے بعد کیوں بند ہے؟

جواب نمبر3:

ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ نبوت کی تکمیل ہو چکی ہے۔جس طرح سورج کے نکلنے کے بعد کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہتی اسی طرح حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد کسی بھی قسم کی نئی نبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

---

[1] سورۃ الانفال آیت نمبر 53

"تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا"[1]

"اپنے رب کے حکم سے وہ ہر آن پھل دیتا ہے"

یعنی شجرہ اسلام قیامت تک سرسبز و شاداب اور فیضان رساں رہے گا۔ اسلام کا فیضان قیامت تک منقطع نہیں ہو گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خود بتادیا کہ اسلام کا فیضان قیامت تک منقطع نہیں ہو گا تو اس اس سے نئے نبی کی گنجائش خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام:

نبوت ایک نعمت ہے لیکن حضور ﷺ کے تشریف لانے سے اس نعمت کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اور حضور ﷺ کی نبوت ایسی کامل نبوت ہے کہ اب تا قیامت حضور ﷺ کی نبوت ہی چلے گی۔

---

[1] سورۃ ابراہیم آیت نمبر 25

عصر حاضر کا فتنہ الحاد

محمد فاروق کراچی

اسلام کا نام لے کر اسلام کو ڈسنا، اسے تحریفی نشتر لگانا، اس پر جرح و تنقید کی مشق کرنا اور محض مفروضات سے اُس کے قطعی مسائل کو پامال کرنا ہر دور کے ملاحدہ وزنادقہ کا طرئہ امتیاز رہا ہے۔ پہلی صدی کے خوارج ہوں یا مابعد کے باطنیہ، تیسری صدی کے اصحاب العدل والتوحید ہوں یا دورِ حاضر کے "ارباب فکر و نظر"، دوسری صدی کا ابن المقفع ہو یا چودھویں صدی کا اسلم جیر اجپوری، اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی ہوں یا ہمارے دور کے جاوید غامدی، ماضی قریب کے ڈاکٹر فضل الرحمن اور عمر احمد عثمانی ہوں یا آج کا عمار خان ناصر، سب کا مشترک مقصد، مشترک نقطۂ نظر اور مشترک سرمایہ اسلام کی چار دیواری میں رخنہ اندازی کرنا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کی اصل روح پہلی صدی کے وسط یا تقریباً آخر میں دفن ہو کر رہ گئی۔ اور اب جو "مدونِ اسلام" تیرہ یا چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے پاس موجود ہے، یہ وہ اسلام نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا؛ بلکہ یہ اسلام "مردہ کا ورثہ" اور "زندگی کی حرارت" سے محروم جسد بے روح ہے [2]۔ نعوذ باللہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے امت محمدیہ سے اجتماعی عذاب اُٹھا لیا ہے۔ یعنی اب اس امت پر کوئی ایسا عذاب نہیں آئے گا کہ جس سے پوری امت ہلاک و برباد ہو جائے؛ لیکن اہل ایمان کے امتحان اور آزمائش کے لیے فتنے برابر پیدا ہوتے رہیں گے؛ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "كل شيء ينقص، إلا الشر، فإنه يزاد فيه" "ہر چیز میں کمی ہو گی لیکن شر (و فتن) میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا [3]۔

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 12، جلد: 99، صفر 1437 ہجری مطابق دسمبر 2015ء

[2] فکر و نظر ج:۲، ش:۳، ص:۱۵۳۔ بحوالہ تجد دپسندوں:۸۔

[3] مسند احمد، بحوالہ دورِ حاضر کے فتنے اور ان کا۔

فتن:

فتنہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو متعدد معانی کے لیے قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن معروف معنی دنگا فساد ہی ہے۔
اور اسی معنی میں یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ روز مرہ کی گفتگو میں بھی "فتنہ وفساد" وغیرہ الفاظ ہم استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق امت محمدیہ مسلسل فتنوں کا شکار رہے گی۔
آج نقشۂ عالم پر نگاہ دوڑائیے! حرمین شریفین سے لے کر تمام عرب ممالک، ایشیاء، یورپ، افریقہ اور امریکہ سبھی خطے شر ور وفتن کی لپیٹ میں ہیں۔ آفات ومصائب کا ایک عالمی طوفان ہے جو بڑھتا چلا جارہا ہے، فتنوں پر فتنے اٹھ رہے ہیں، دینی وعلمی فتنے، ملکی وقومی فتنے، تہذیب وتمدن کے فتنے، آرائش وآشائش کے فتنے، سرمایہ داری کے فتنے، غربت وافلاس کے فتنے، اخلاقی وسیاسی فتنے، عقل پرستی کے فتنے، داخلی وخارجی فتنے حتیٰ کے نورانی اور روحانی فتنے۔ ایک تسلسل کے ساتھ تمام فتنے دنیا میں پھیلتے چلے جارہے ہیں، دنیا کا کوئی بھی خطہ شاید ایسا نہیں جو فتنوں سے بالکلیہ محفوظ اور مامون ہو۔
اور انتہائی کرب ناک صورت حال یہ ہے کہ دشمنان اسلام کی سازشوں کے نتیجے میں عالم اسلام فتنوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسلام کے نام پر فتنے، اسلامی عقائد اور اسلامی اعمال میں فتنوں کی ایک شورش برپا ہے۔ فریق مخالف کے خلاف کفر وضلال کی مشین گن تھامے ہر کوئی اسلام کا ٹھیکیدار نظر آتا ہے۔ یورپ سے درآمد شدہ دانشور مسلمانوں کے ایمان کو ختم یا کم از کم کمزور کرنے کے لیے آئے دن "نئی تحقیق" اور "جدید ریسرچ" کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ قلمی جولانیاں، زبان کی سلاست وروانی، چرب لسانی کے ذریعے اذہان وعقول کو متاثر کر کے احکام دین سے باغی کرنا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ اُن سے اور کچھ نہ بن پڑے تو اچھے بھلے مسلمان کو اس کے عقائد وافکار کے حوالے سے شک میں تو ڈال ہی دیتے ہیں۔ اور یہ سب اِس وجہ سے ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے خالق سے بے پروائی اختیار کرلی ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: "ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا." جو ہماری یاد سے منہ موڑے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔ آج ہماری پستی وذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خالق کائنات سے روگردانی کر رکھی ہے۔
فتنوں کی اِس بھرمار میں سب سے خطرناک ایمان سوز فتنے ہیں؛ کیونکہ کسی بھی مسلمان کے لیے سب سے قیمتی چیز ایمان ہے، جب متاعِ ایمان ہی لٹ جائے تو دنیا وآخرت کی سب خیریں گویا چھن گئیں؛ چنانچہ احادیث میں فتنۂ دجال کو بڑا فتنہ قرار دیا گیا؛ کیونکہ وہ ایمان کے لیے خطرناک ہوگا۔ انھیں ایمان سوز فتنوں میں سے ایک "فتنہ الحاد" ہے۔ جس کا معنی: راہِ راست سے ہٹ جانا، بے دینی اور مذہب بیزاری اختیار کرنا ہے۔ یعنی حق سے منحرف ہو کر اس میں بے بنیاد باتیں داخل کر دینا۔ اور دینی احکام کے بارے میں غلط قسم کی تاویلیں کرنا۔ مختصریوں کہہ لیں کہ دین میں تحریف، ردوبدل یا دین کے نام پر دین سے دُوری کا نام اِلحاد ہے۔

فتنہ الحاد:

اِس فتنۂ الحاد سے اسلام اور اہل اسلام کا واسطہ کوئی نیا نہیں، جب سے اِسلام آیا تب سے اِسلام میں تحریف کر کے لوگوں کو اسلام سے دُور کرنے والے بھی موجود ہیں۔ اُسی زمانے سے ملحدین نے دینی احکام کو کھیل اور مذاق سمجھ کر تاویلاتِ باطلہ کا نشانہ بنائے رکھا۔ اور مسلمانوں کو اُن کے دین سے کاٹنے اور دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ علمائے اسلام اپنی شرعی اور دینی ذمہ داری کی بدولت ان فتنوں کا تعاقب کرتے رہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا اور آج ہم ان فتنوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ماضی قریب میں سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز، غلام احمد قادیانی، ڈاکٹر فضل الرحمن، عمر احمد عثمانی، ابو الاعلیٰ مودودی، عنایت اللہ مشرقی اور ان جیسے متجددین اِسی سلسلے کی کڑیاں گزری ہیں۔

دورِ حاضر میں بھی یہ فتنہ مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ سب سے پہلے میں جاوید غامدی صاحب اور ان کے فکری جانشین جناب عمار خان ناصر کا نام لینا چاہوں گا؛ کیونکہ یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے دین کی از سرِ نو تشکیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور اللہ کے نازل کردہ دین میں سے صحابہ کرام سے لے کر آج تک کی چودہ صدیوں کے علماء، فقہاء، محدثین و مفسرین کے آراء کے برخلاف "جو کچھ" غامدی صاحب کے سمجھ آسکا، وہ انھوں نے اپنی کتاب "میزان" میں بیان کر دیا ہے۔[1]

غامدی صاحب نے تشکیل جدید میں پہلا حملہ قرآن پاک پر کیا کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے "عربی دانی"۔ قرآن سمجھنے کے لیے نہ کسی تفسیر کی پابندی ضروری ہے نہ تشریحات سلف کی پیروی۔[2] اور "سنت" کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "سنت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے افعال وعادات نہیں؛ بلکہ "دین ابراہیمی کی روایت" ہے، جسے آپ... نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ نیز سنت کو سمجھنے کے لیے دین ابراہیمی کے حاملین (یہود و نصاری) کے عمل و تواتر کو دیکھا جائے گا۔ (امت محمدیہ کے تواتر عملی کو نہیں۔)"[3] اور تیسرا اُصول یہ وضع کیا کہ "حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کے لیے مدار شریعت نہیں، "فطرت" اور عقل انسانی ہے۔"[4] اِن اُصولِ ثلاثہ

---

[1] میزان، ص:۱۱، طبع ۲۰۱۴ء۔

[2] میزان:۲۵، ط:۲۰۱۴ء۔

[3] میزان، ص:۱۴ .... ص:۴۷، ط:۲۰۱۴ء۔

[4] میزان، ص:۱۴ .... ص:۵۹، ط:۲۰۱۴ء۔

سے دین کا کوئی جز بچتا نظر آئے، مثلاً حدود و تعزیرات اور اِقدامی جہاد وغیرہ تو اُس کے بندوبست کے لیے "قانونِ اتمام حجت" نامی اصطلاح معرضِ وجود میں لائی گئی۔

لیجیے! قرآن مجید کی تمام تر تفاسیر سے بھی آزادی ملی، سنت کے نام پر "ملاں لوگ" جو قیود لگاتے ہیں اُن سے بھی جان چھوٹی اور "شریعت" کے گورکھ دھندے سے بھی خلاصی ہوئی۔ اَب غامدی صاحب ہیں اور قرآن کی آیات۔ اپنی "عربی دانی" کی بنیاد پر جس آیت کی جو چاہیں تشریح کریں۔ غامدی صاحب ہیں اور "دین ابراہیمی کی روایات"۔ لہٰذا سنتوں کی تعداد سمٹ کر ۲۷/ رہ گئی۔ غامدی صاحب ہیں اور ان کی "فطرت سلیمہ"۔ لہٰذا اپنی فطرت سے سوال کر کے، جسے چاہیں حلال قرار دیں اور جسے چاہیں حرام۔ رہی سہی کسر "قانون اتمام حجت" پوری کر دے گا۔ رہے نام ملتِ غامدیہ کا۔۔!!

اِسی اُصول کے پیش نظر اُنہوں نے حیات عیسیٰ، ظہورِ مہدی، حجیت حدیث، ڈاڑھی کی سنیت، حجیتِ اجماع، رجم کی حد، قرآن کریم کی مختلف قراآت، تصوف، مسلم وغیر مسلم اور مرد وعورت کی گواہی میں فرق، زکوۃ کے معین نصاب اور نبی کریم کی افعال واعمال کی سنیت کا انکار کر دیا کہ "قرآن اِن سے خاموش ہے۔" اور موسیقی، تصویر، بیمہ وغیرہ کو اس لیے جائز قرار دیدیا کہ "قرآن اِن سے منع نہیں کرتا۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیکڑوں سنتوں کا اِنکار اِس بنا پر کر دیا کہ "دین ابراہیمی کی روایت نہیں۔" اور کھانے کی چیزوں میں چار چیزوں کے سوا سب کی حرمتِ شرعی کا انکار کر دیا کہ "وہ فطرت پر موقوف ہیں۔"[1] اور اِقدامی جہاد، مرتد کی شرعی سزا اور مسئلہ تکفیر کو "قانونِ اتمام حجت" میں نمٹا دیا۔

عمار خان صاحب اکثر مسائل میں تو غامدی صاحب کے بالکل قدم بہ قدم ہیں؛ چنانچہ تفسیر بالرائے، انکارِ اِجماع، انکارِ سزائے ارتداد ورجم، اقدامی جہاد کے انکار اور تصوف واہل تصوف کے استہزاء میں بعینہٖ غامدی اصغر ہیں۔ اور بعض مسائل جن میں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے غامدی صاحب سے اتفاق کیا تو امت کی اجماعی رائے کی روشنی میں دائرہ اسلام سے خارج قرار پاؤں گا تو اُن میں اِنکار کی بجائے تشکیک اور نفس

---

[1] حیات عیسیٰ، میزان، ص:۱۷۸، ظہورِ مہدی، میزان، ص:۱۷۸، اقدامی جہاد، اشراق، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۲، حجیت حدیث: میزان، ص:۱۵، ڈاڑھی، مقامات، ص:۱۳۸، اجماع، اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۲، مرتد کی شرعی سزا، اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶۴، رجم کی حد، برہان، ص:۳۵، قرآت قرآن، اشراق، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص:۶۱، مرد وعورت کی گواہی، برہان، ص:۲۵ تا ۳۴، زکوٰۃ کا نصاب، اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۶۴، موسیقی وتصویر، اشراق، فروری ۲۰۰۸ء، ص۶۹، بیمہ، اشراق، جون ۲۰۱۰ء، ص:۲۔

مسئلہ کی اصل حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ چنانچہ ڈاڑھی کی شرعی حیثیت، حیات عیسیٰ اور مسئلہ تکفیر وغیرہ مسائل میں وہ اِسی راہ پر گامزن ہیں۔[1]

اِن افکار کا یقینی نتیجہ مذہب بیزاری، دینی تشکیک و تذبذب، تمام امت اسلامیہ کی تجہیل اور تحمیق اور قدیم علماء امت اور حاملین دین کو نا قابل اعتماد مجرم قرار دینا اور اسلام کی پوری تاریخ تاریک در تاریک دِکھلانا ہے۔ غامدی صاحب کے وضع کردہ فہم دین کے اُصولوں کے نتیجے میں کیا کچھ ہمارے ہاتھ سے جاتا ہے؟ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ صاحبِ قرآن نے فرمایا وہ نا قابل اعتبار ٹھہرا کہ "قرآن سمجھنے کا مدار فقط "عربی دانی" ہے۔" اقوالِ صحابہ و تابعین، تشریحاتِ مفسرین اور فقہاء کرام کے قرآن سے اخذ کردہ مسائل و احکام سب بیک جنبش قلم نا قابل التفات ٹھہرے۔ سنت رسول اور آثار صحابہ کی پابندی بھی غیر لازم ہوئی کہ "سنت تو دین ابراہیمی کی روایت ہے۔" اور اجماع کو تو غامدی صاحب نے صاف لفظوں میں "بدعت" اور عمار خان نے "علمی افسانہ" لکھ دیا۔ یوں پوری امت مبتدع و افسانوی کردار کی حامل ٹھہری۔ تصوف کو جناب نے "عالمگیر ضلالت" قرار دے کر تمام صوفیاء ملت کو "گمراہی" کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ یہود و نصاریٰ کے لیے نبی کریم پر ایمان کو غیر ضروری قرار دے کر کلمہ اسلام کی اہمیت ختم کر ڈالی۔ الغرض کلمۂ اسلام سے لے کر دین کے معمولی حکم تک سب کو غامدی صاحب نے مردود، نا قابل التفات، یا مشکوک کر دیا۔ اور چودہ صدیوں کا اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کا موقف غیر معتبر ٹھہرا۔ اَب دین کو سمجھنے کا واحد ذریعہ عقلِ غامدی اور فطرتِ عمار ہے۔ ۔!! اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنۡہُ •

طرفہ تماشا یہ ہے کہ اِس "تحریف دین" کا نام "تحقیقِ اسلام" اور "اِلحاد فی الدین" کا نام "اظہارِ حقیقت" رکھا جاتا ہے۔ غامدی و عمار صاحبان کے علاوہ دیگر ملحدینِ زمانہ میں زید حامد، فرحت ہاشمی اور ان جیسے دسیوں پروفیسرز، بیسیوں ڈاکٹرز اور نام نہاد دانشوران شامل ہیں۔ جنھوں نے مختلف ٹی وی چینلز، پرنٹڈ و الیکٹرانک میڈیا اور مختلف لیکچرز و انٹرویوز میں آئے دینی احکام کی من پسند تشریحات و توضیحات کر کے قوم کو گمراہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان سے ہٹ کر اسکولوں کالجوں میں رائج انگریزی کلچر، یہود و ہنود کی تہذیب و تمدن بھی اِلحاد پھیلانے میں پیش پیش ہے، اسی کو دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراخی تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

---

[1] الشریعہ اشاعت خاص، جون ۲۰۱۱ء۔

ابتدا ہی سے بچوں کے گلے میں ٹائی لٹکا کر ان کو عیسائی تہذیب سے مانوس اور اسلامی تہذیب سے بے گانا کیا جاتا ہے، بود و باش، رہن سہن، شکل وصورت، لباس وغیرہ سب کچھ عیسائیوں کے طرز پر ہے، مخلوط تعلیم ہم نے شروع کرر کھی ہے، بے حیائی اور فحاشی کے حلقے ہمارے گھروں میں لگے ہوئے ہیں، قومی و دینی غیرت کا جنازہ ہم نے نکال رکھا ہے، ہندوؤں کے تہوار ہم نے اپنا رکھے ہیں، اقبال کہتا ہے:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

تم مسلماں ہو جن کو دیکھ کر شرمائیں یہود؟

گویا لادینیت، الحاد، سیکولرازم، لامذہبیت اور دین سے دُوری کی جتنی ممکنہ صورتیں ہیں، کفار نے وہ سب اختیار کر رکھی ہیں، اپنے ایجنٹ اسلامی ممالک میں بھیج کر ہمارے میڈیا پر اُن کو "اسلامی سکالرز" باور کرایا ہے؛ حالانکہ اُن کا مقصد اور واحد مقصد مسلمان قوم کو خدا، نبی اور قرآن سے کاٹنا اور دُور کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ والوں، نبی کے وارثوں اور قرآن کے حاملین سے قوم کو بدظن کریں۔ سو اِس کوشش میں دِن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ: یہ اسکالرز "ناموس رسالت" کے قانون کے غلط استعمال کا تو بہت واویلا مچاتے ہیں؛ لیکن بیسیوں دیگر قوانین کے غلط استعمال پر ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ شرعی حدود کے نفاذ پر تو چیخ اٹھتے ہیں؛ لیکن ماوائے عدالت قتل اور دیگر انسانیت سوز مظالم پر ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں فتنوں سے حفاظت اور پناہ کی دعا مانگتے تھے، وہیں یہ دعا بھی مانگتے تھے کہ یا اللہ! جب تو کسی قوم کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہے تو مجھے فتنہ میں ڈالے بغیر اٹھا لینا۔ گویا فتنوں سے حفاظت کے دو طریقے ہیں:

۱- اللہ تبارک و تعالیٰ فتنے کے زمانہ سے پہلے اٹھالے۔

۲- فتنوں کے زمانے میں ہونے کے باوجود اللہ کریم اپنی رحمت سے فتنوں سے محفوظ فرمادے۔ ہم لوگ فتنوں کے زمانے میں موجود ہیں؛ اس لیے پہلی صورت تو ممکن نہیں؛ البتہ دوسری صورت ممکن ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور وہ اپنی رحمت کاملہ سے ہمیں فتنوں سے محفوظ فرمالے۔

خارجی وداخلی فتنوں، آپس کے خلفشار اور باہمی تنازعات سے حفاظت کے لیے ہمیں جو اقدامات کرنے چاہئیں وہ یہ ہیں:

۱- اکابر پر مضبوط اعتماد۔

۲- علماء، فقہاء اور اہل دین سے حسنِ ظن۔

۳- کسی صاحبِ نسبت سے گہرا تعلق۔

۴- رجوع الی اللہ کا اہتمام۔

۵- اہل خیر وصلاح سے مشورہ۔

۶-اعتدال پسندی۔

۷-بلا تحقیق بات قبول کرنے یا پھیلانے سے احتراز۔

۸-اکرام واحترام مسلم۔

۹-باہمی اختلاف وانتشار یا اس کے اسباب سے کلی پرہیز۔

علماء و مصلحین کے لیے ایمان و تقویٰ، اخلاص و عمل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، امت کی اصلاح کے لیے تڑپ، گروہ بندی اور افتراق سے پرہیز .... اور علمی فتنوں کی سرکوبی کے لیے ٹھوس علمِ دین، جدید علمِ کلام، جدید سائنس، معلوماتِ عامہ، حسنِ تحریر، شگفتہ بیانی، سنجیدہ متوازن دماغ، پیہم کوشش اور صالح و موثر لٹریچر کا حصول نہایت ضروری ہے۔ **واللہ الموفق**

بائبل مقدس کے محرف ہونے کے متعلق اہل اسلام کے دعوے کے ساتھ ہی مسیحی برادری کی جانب سے عجیب طرح کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن کا جواب دینے پر بھی مسیحی برادری اسے معقول تسلیم نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے مضمون ہذا میں مسیحی برادری کو ان کے چند روایتی سوالات کا غیر روایتی جواب ان ہی کے گھر کی گواہی سے دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ حقیر سی کاوش کسی مسیحی بھائی کی آنکھیں کھول دے۔

سوال نمبر ا: کیا بائبل بدل گئی ہے؟

الجواب:

جی ہاں بالکل بائبل بدل گئی ہے اور اس کا اقرار خود بائبل میں بھی موجود ہے.
تُم کیونکر کہتے ہو کہ ہم تو دانش مند ہیں اور خُداوند کی شریعت ہمارے پاس ہے؟ لیکن دیکھ لکھنے والوں کے باطِل قلم نے بطالت پَیدا کی ہے۔[2]

---

[1] محمد فرمان شیخ: ایم اے، ایم ایڈ، ایم فل، فاضل تقابل ادیان

[2] یرمیاہ 8:8

خُداوند کی طرف سے بارِ نبُوّت کا ذِکر تُم کبھی نہ کرنا اِس لِئے کہ ہر ایک آدمی کی اپنی ہی باتیں اُس پر بار ہوں گی کیونکہ تُم نے زِندہ خُدا ربُّ الافواج ہمارے خُدا کے کلام کو بِگاڑ ڈالا ہے۔[1]

.پادری جی ٹی مینلی لکھتے ہیں "بائبل میں ربانی اور انسانی عناصر ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے. ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات ربانی ہے اور یہ انسانی "[2] پادری صاحب واضح اقرار کر رہے ہیں کہ بائبل میں الہامی کے ساتھ انسانی عنصر بھی موجود ہے۔

سوال نمبر ۲: کیا بائبل کو کوئی بدل سکتا ہے؟

الجواب:

جی ہاں بائبل میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے بلکہ نبی کی موجودگی میں ایسا ہوا ہے جب شاہ یہوداہ یہویاقیم نے وحی کا طومار جلایا اور بعد میں الہی ہدایت پر یرمیاہ نبی نے باروخ منشی سے اسے دوبارہ لکھوایا تو باروخ نے اس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کر دیا۔

یَرمیاہؔ نے دُوسرا طُومار لِیا اور بارُوک بِن نیریاؔہ مُنشی کو دِیا اور اُس نے اُس کِتاب کی سب باتیں جِسے شاہِ یہُوداؔہ یہویقِیم نے آگ میں جلایا تھا یَرمِیاؔہ کی زُبانی اُس میں لِکھیں اور اُن کے سِوا وَیسی ہی اَور بُہت سی باتیں اُن میں بڑھادی گئیں۔[3]

سوال نمبر ۳: بائبل کس نے بدلی؟

الجواب:

اوپر سوال میں اس کا جواب گزر چکا ہے کہ بائبل کس نے بدلی، اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے:

اگر بائبل میں تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا تو پھر تورات کی پانچویں کتاب تثنیہ شرع کے آخر میں موسی علیہ السلام کی وفات کا حال کیا موسی نے قبر سے اٹھ کر لکھا ہے؟

---

[1] یرمیاہ 23:36

[2] بحوالہ ہماری کتب مقدسہ، صفحہ 28

[3] یرمیاہ 36:32

مرقس کی انجیل کے آخری 12 فقرات قدیم نسخوں میں کیوں غائب ہیں؟ گڈ نیوز بائبل کے 19799 کے ایڈیشن کے فٹ نوٹ میں مرقس کی آخری بارہ آیات کے متعلق لکھا ہے:

"Some manuscripts and ancient translations do not have this ending to the Gospel (verse 9-20")

اسی طرح نیو انٹر نیشنل ورژن میں ان فقرات سے قبل کچھ اس طرح کا توضیحی نوٹ دیا گیا ہے.:

"The earliest manuscripts and some other ancient witnesses do not have Mark 16:9-20"

اس طرح کے فٹ نوٹس جگہ جگہ ان دونوں بائبلز کے نسخ پر موجود ہیں جو کہ یونائیٹڈ بائبل سوسائٹی امریکہ کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔
قدیم نسخہ واشنگٹن میں بھی مرقس کی آخری 122 آیات موجود نہیں۔[1]
کنگ جیمز ورژن کلام الہی ہے؟ گڈ نیوز بائبل یا پھر نیو انٹر نیشنل ورژن؟ تینوں میں سے ایک کا انتخاب فرما دیجیے اگر یہ تاویل نکالی جائے کہ تینوں ہی کلام الہی ہیں تو پھر NIV اور GNB میں جو آیات حدف کی گئی یا مشکوک قرار دی گئی ہیں ان کو کس پیرائے میں رکھا جائے گا؟

سوال نمبر ۴: بائبل کب تبدیل کی گئی؟

الجواب:

جب یہ کتب زیر تحریر تھیں اسی وقت ان میں تغیر و تبدل کا عمل بھی جاری وساری تھا. وہ لوگ جن کے ہاتھ میں بائبل ہے اور ان کی ساری زندگی اس کے تراجم و تحقیق کرنے میں کھپ گئی ہیں وہی کہہ رہے ہیں کہ بائبل مقدس میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے تو پھر اس اعراض کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے؟ میری مراد متحدہ انٹر نیشنل بائبل سوسائیٹی سے ہے جس نے پاکستان میں DISCOVER THE BIBLE کا ترجمہ معتدبہ کلام مقدس کے نام سے بڑے طمطراق سے شائع کیا ہے اور اس میں جابجا تحریف کا اقرار بانگ دہل کیا گیا ہے. یہ کتاب ایک فرد کی نہیں بلکہ 18 چوٹی کے علماء نے مل کر لکھی ہے۔
ہر کلیسیاء کی خواہش ہوتی تھی کہ ہمارے پاس انجیل یا پولس کے خط کا اپنا نسخہ ہو. جب ان تحریروں کی نقول تیار کی گئیں تو نقل نویس جنہیں منشی کہا جاتا تھا وہ ان تحریروں کو پاک ناشتے خیال نہیں کرتے تھے. وہ فقط پولس یا پطرس کے کسی خط یا اپنے جیسے کسی مسیحی کی لکھی ہوئی انجیل کی

[1] بحوالہ صحت کتب مقدسہ، صفحہ 178، مطبوعہ 1952

نقل کر رہے ہوتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سہواً غلطی کرنے کے علاوہ بعض اوقات ارادتاً تبدیلیاں بھی کر دیتے تھے رفتہ رفتہ دوسری صدی عیسوی میں مسیحی ان تحریروں کو پاک ناشتے سمجھنے لگے۔[1]

نئے عہد نامہ کی نقلیں تیار کرتے ہوئے نقل نویس بعض اوقات متن میں تصرفات کر دیتے تھے بعض اوقات تصرفات دانستہ یا ارادی ہوتے تھے تاکہ اسلوب بیان بہتر ہو جائے یا زبان قواعد گرائمر کے مطابق ہو جائے۔ دوسرے دانستہ تصرفات اس لیے کئے گئے کہ ایک انجیل کے متن کو دوسری انجیل کے متن کے مطابق یا پولس کے خط کے مندرجات کو اسی کے دوسرے خط کے مطابق بنا دیا جائے۔[2]

33. کئی تصرفات غیر ارادی تھے، اس کا سبب پڑھنے میں غلطی یا ناقص یادداشت ہے۔ غلطی اس طرح ہوگئی کہ کبھی منشی کی نظر کسی ایک حرف، ایک لفظ یا کبھی پوری سطر سے اچٹ گئی اور ایک لفظ یا کئی لفظ سہواً نقل ہونے سے رہ گئے۔ کبھی یہ ہوا کہ متن کو غلط پڑھا اور غلط حرف یا غلط لفظ نقل کر دیا یا کبھی غلطی سے کوئی لفظ یا چند الفاظ مکرر کر دیئے۔[3]

سوال نمبر ۵: تورات اور زبور کب بدلیں؟ مسیح سے قبل یا بعد میں؟

الجواب:

تورات و زبور میں اگر تبدیلی نہ ہوئی ہوتی تو انجیل جیسی کتاب کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تورات کی غیر محرف موجودگی میں انجیل کی حیثیت کچھ باقی نہیں رہتی۔

کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت صفحہ 77 پر لکھا ہے کہ یہودی نوشتوں میں مندرج واقعات دراصل زبانی روایات ہیں جن کا انتقال صدیوں تک سینہ بسینہ ہوا اور اس کے بعد حتمی شکل میں لکھے گئے۔ معلوم ہوا کہ مروجہ تورات فقط بنی اسرائیل کی زبانی روایات ہیں کیونکہ انہدام ہیکل کے بعد تو یہود کے پاس تورات باقی ہی نہیں بچی تھی۔

یاد رہے کہ اس وقت کے یہودی علماء کے نزدیک مروجہ عبرانی بائبل میں شامل کتب کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب مقدس متون کے طور پر رائج تھیں۔ یہودیوں نے جامنیہ کونسل منعقد کر کے اس بات کا فیصلہ کیا کہ کن کتب کو الہامی کتب میں رکھنا چاہیے اور کن کو خارج کر دینا چاہیے۔ کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت صفحہ 8 پر مرقوم ہے "100ء کے قریب کچھ یہودی علماء Jamnia کے مقام پر جمع ہوئے۔ اس موقع پر یہ بحث

---

[1] بحوالہ معتدبہ کلام مقدس، صفحہ 121

[2] بحوالہ معتدبہ کلام مقدس، صفحہ 124

[3] بحوالہ معتدبہ کلام مقدس، صفحہ 125

ہوئی کہ کون سی کتب یہودی نوشتوں میں شامل ہونی چاہئیں". معلوم ہوا کہ اس وقت بھی یہودی کتب مقدسہ تحریف کا شکار تھیں تبھی یسوع جیسے عظیم ربائی کی آمد کے باوجود وہ مقدس نوشتوں کی استنادی حیثیت کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہی رہے.

مروجہ زبور کی کتاب میں 1500 زبور شامل ہیں جن میں سے اکثریت کے مصنفین کا کچھ معلوم نہیں. ایف ایس خیر اللہ لکھتے ہیں. "زبور 90 تا150 ایسے زبوروں پر مشتمل ہے جس کے مصنف تقریباً سب ہی گمنام ہیں".[1] اگر زبور کی کتاب اصل الہام پر قائم ہے تو پھر ان ساٹھ زبوروں کو کیا کیا جائے جن کے مصنفین ہی گمنام ہیں؟ اگر یہ مجہول لوگوں کی تصنیف ہیں تو پھر یہ الہامی کیسے؟

سوال نمبر ٦: انجیل کتنے عرصے بعد بدلی گئی؟

الجواب:

یسوع کی اصل انجیل تو ان کے ساتھ ہی آسمان پر چلی گئی تھی. انکے مابعد یسوع کے مخلصین نے ان کی تعلیمات کو لکھ کر محفوظ کیا اس طرح سینکڑوں اناجیل معرض وجود آگئیں نتیجتاً مقدس پولس کو ان لوگوں پر ملعون ہونے کا فتوی صادر کرنا پڑا جنہوں نے پولس کی بنائی ہوئی انجیل کے علاوہ کسی اور انجیل پر ایمان رکھا. "اگر ہم یا آسمان سے کوئی فرشتہ سوائے اس انجیل کے جو ہم نے تمہیں سنائی ہے دوسری انجیل تمہیں سنائے تو وہ ملعون ہو"[2]۔

تیس سال بعد ہی یہودی بغاوت کے نتیجے میں رومیوں نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی نتیجتاً وہ کثیر مواد ضائع ہوگیا جو یسوع کی اصل تعلیمات پر مشتمل تھا اور یسوع کی لسان مبارک سے وہ انجیل جس کا ذکر مرقس بار بار اپنی کتاب میں کرتا ہے، سننے والے لوگ رومی عتاب کا شکار ہو کر ابدی نیند سو گئے. مروجہ اناجیل اسی تباہی کے بعد کے زمانے میں لکھی گئیں اور تقریباً تین سو سال تک یہ کتب کلیسیاء میں متنازع و مشکوک رہیں کہ آیا یہ کلام الٰہی ہیں بھی یا نہیں.

"ابتدائی کلیسیاء کے بزرگ اور کونسلیں اس بات پر بحث کرتی رہیں کہ نئے عہد نامہ کی کون سی تحریروں کو پاک سمجھنا اور وہی تعظیم دینا چاہیے جو یہودی نوشتوں کو حاصل ہے"[3]۔

---

[1] بحوالہ قاموس الکتاب، صفحہ 470

[2] غلاطیوں 1:8

[3] بحوالہ کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت، صفحہ 8

رومی کلیساؤں میں بہت سی کتب گردش کرتی تھیں۔ ضروری ہوا کہ کسی عمل کے ذریعے فیصلہ کیا جائے کہ کون سی کتب مقدس ہیں. یہ طریقہ کار راتوں رات وضع نہیں کیا گیا بلکہ ان کتب کے لکھے جانے کے بعد بھی سینکڑوں سال لگ گئے

تب کہیں جاکر فیصلہ ہوا کہ جو اتنی بہت سی تحریریں پڑھی جارہی ہیں ان میں سے کون سی پاک کتاب یعنی بائبل میں شامل ہونی چاہیے"[1]

"آج بہت سے مسیحی ان کتب سے ناواقف ہیں جنہیں ابتدائی مسیحیوں اپنے پاک نوشتوں کا حصہ مانتے تھے".[2]

اگر یہ الہامی کتاب ہوتی تو یسوع کے سو سال بعد نہیں لکھی جاتی اور نہ ہی اس کی الہامی حیثیت چار سو سال تک مشکوک رہتی. یہ سب تو ٹھوس کلیسائی شواہد ہیں جن کا انکار فقط ہٹ دھرمی کی بناء پر ہی کیا جاسکتا ہے.

مقدس پولس لکھتے ہیں "جب یہ خَط تُم میں پڑھ لِیا جائے تو اَیسا کرنا کہ لَودیکیہ کی کلِیسیا میں بھی پڑھا جائے اور اُس خَط کو جو لَودِیکیہ سے آئے تُم بھی پڑھنا"[3] پولس کے حکم کے مطابق لودیکیہ کا خط آج کی کلیسیاء بطور الہام کیوں نہیں پڑھتی حالانکہ اس خط کو مقدس نوشتے کے طور پر پڑھنے کا حکم خود مقدس پولس نے دیا ہے.

"کلیمنٹ کے خط کے متعلق کرنتھیوں کا بشپ ڈایونی سیئس 1700ء میں کہتا ہے کہ "قدیم زمانہ سے ہی اس خط کو گرجا میں پڑھے جانے کا دستور چلا آرہا ہے".[4] اگر انجیل میں تحریف نہیں ہوئی تو قدیم کلیسیاء کے نزدیک مقدس و ملہم سمجھا جانے والا خط آج کی کلیسیاء کیوں نہیں قبول کرتی؟

سوال نمبر ۷: کیا بائبل بدل سکتی ہے؟

الجواب:

"ہمارے پاس یسوع مسیح کے بالکل صحیح الفاظ کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں. ہمارے پاس اس کے الفاظ کے صرف یونانی ترجمے موجود ہیں جو اناجیل کے مصنفین نے استعمال کیے[5] اگر مسیحی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ تحریف واقع نہیں ہوئی تو پھر یسوع مسیح کی اصل آرامی زبان میں ان کے اقوال و

---

[1] بحوالہ کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت، صفحہ 9

[2] محولہ بالا، صفحہ 10

[3] کلسیوں 4:16

[4] بحوالہ صحت کتب مقدسہ، صفحہ 216، مطبوع 1952

[5] بحوالہ معتدبہ کلام مقدس، صفحہ 118

فرامین دکھادیں کیونکہ اصل اصل ہوتاہے اور ترجمہ کبھی بھی اصل کی جگہ نہیں لے سکتا یا پھر یہ ثابت کردیں کہ یسوع مسیح نے یونانی زبان میں اپنے ارشادات فرمائے تھے اور یونائیٹڈ بائبل سوسائٹی امریکہ جھوٹ بول رہی ہے تب ہی آپ کی بات میں کوئی وزن ہوگا بصورت دیگر تو ہوا میں تیر چلانے والی بات ہے یسوع مسیح کے اصل الفاظ کا گم ہوجانا کیا معنی رکھتاہے؟ یادرہے یسوع مسیح کی زبان آرامی تھی[1]۔

عہد جدید کی آخری کتاب مکاشفہ کے آخر میں اس کتاب میں تبدیلی کرنے والے کے لیے سخت وعید سنائی گئی ہے جو کہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بائبل میں تبدیلی کی جاسکتی ہے تبھی تو اس کی سزا موجود ہے. جیسا کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے. اب اگر اس جرم کا احتمال موجود ہے تبھی تو اس کی سزا رکھی گئی ہے اسی طرح بائبل میں تبدیلی کا امکان تھا تبھی مکاشفہ میں سزا رکھی گئی ہے.

سوال نمبر ۸: کیا بائبل پوری کی پوری بدل گئی ہے؟

الجواب:

اصل بائبل بدلی ہی نہیں بلکہ مکمل مفقود ہو چکی ہے. مروجہ بائبل میں مشمولہ کتب کے لیے مسیحی علماء نے ایک نئ اصطلاح "Pseudepigrapha" وضع کی ہے جس کا مطلب از منہ قدیم میں مجہول تصنیف کا معروف شخصیت کی طرف انتساب ہے اور عہد جدید و قدیم میں شامل تمام کتب یہی استادی حیثیت رکھتی ہیں کہ یہ گمنام لوگوں کے اقلام سے صفحہ قرطاس پر رقم ہوئیں.

."یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان اناجیل کے مصنفین کون کون تھے... امکان ہے کہ ان کے مصنفین مسیح کے وہ ابتدائی پیروکار تھے جنہوں نے یسوع کے پہلے شاگردوں میں سے کسی ایک سے یا زیادہ سے اس کے بارے میں تفصیل سے سنا[2]".

."اسفار خمسہ کو اپنی آخری شکل میں آتے آتے سینکڑوں سال کا عرصہ لگا اور یہ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے بہت بعد میں اس کی شکل میں آئے[3]". اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد موجودہ شکل میں آئے تو پہلے کس شکل میں تھے؟ ارتقاء کا یہ عمل کتاب میں تصرف و تغیر نہیں تو پھر کیا ہے؟ اگر یہ تحریف نہیں تو پھر شاید تحریف کا لفظ ہی لغت سے خارج کردیا جائے.

---

[1] بحوالہ صحت کتب مقدسہ، صفحہ 198

[2] کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت، صفحہ 1733

[3] کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت، صفحہ 26

."متی کی انجیل کی نظر ثانی یونانی زبان میں کی گئی غالباً وہ متی نے خود کی یا اس کے کسی مدد گار نے [1] "اگر متی کی انجیل مکمل الہامی ہے تو پھر نظر ثانی کی ضرورت کیوں؟ کیا خدا کے الہام کو بھی نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور پھر یہ نظر ثانی کس نے کی؟ کس اختیار سے کی؟ اور کن مقاصد کے تحت کی؟ ان سب سوالوں کے مسیحی برادری کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ہے لیکن تحدی پر مبنی دعوی پھر بھی قائم ہے کہ بائبل خدا کا کلام ہے.

سوال نمبر ۹: بائبل (یعنی تورات زبور وانجیل) جو پہلے تھیں وہ کہاں ہیں؟

الجواب:

. یہ سوال ہی غلط اور کٹ حجتی پر مبنی ہے کیونکہ ان کتب کا امین یہودیوں وعیسائیوں کو بنایا گیا تھا نا کہ مسلمانوں کو لہذا مسیحیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل تورات زبور وانجیل سامنے لاکر مسلم نقادوں و معترضین کا منہ بند کر دیں.
. اگر تورات بحیثیت کلام خدا لا تبدیل ہے تو پھر تورات کی وہ الواح کدھر گئیں جو باری تعالٰی نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر موسی علیہ السلام کو دی تھیں؟
. "621 قبل مسیح میں ہیکل کی تعمیر نو کے دوران مزدوروں کو شریعت کی کتاب ملی تھی. یہ شریعت کی کتاب کہاں سے آئی؟ ہیکل کے ذخیرے میں کیسے پہنچی؟ (کس نے لکھی؟ از مقتبس) ممکن ہے کہ اسے موجودہ صورت میں ان کاتبوں اور مدیروں نے مرتب کیا ہو جو صدیوں بعد ہوئے [2]۔ ایک نامعلوم کتاب کو، جس کے مصنف کا ہی نہیں معلوم اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ آئی کدھر سے ہے، کلام الٰہی کا درجہ دینا کہاں کا انصاف ہے؟
. مسیحیوں نے شروع سے ہی جان لیا تھا کہ ہمیں مقدس متون کے ایک ایسے مجموعے کی ضرورت ہے جو ہمارا اپنا ہو، جنہیں حوالے کے لئے استعمال کیا جا سکے جو عقائد سے متعلقہ فیصلوں میں ماخذ اور غیر متغیر حدود ہوں. [3]۔ محولہ سطر سے یہ مستنبط ہوا کہ مروجہ انجیل کلیسیاء کی پیداوار

---

[1] اطلاقی تفسیر برائے عہد جدید، صفحہ 136

[2] بحوالہ کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت، صفحہ 314

[3] بحوالہ معتدبہ کلام مقدس، صفحہ 169

ہے نا کہ کلیسیاء کی بنیاد اس انجیل پر ہے اور جو چیز کلیسیاء نے پیدا ہی اپنی ضرورت کی وجہ سے کی ہے، اسے لا تبدیل کلام الہی بنا کر پیش کرنا قطعاً خوف خدا سے ماوراء عمل ہے اور امثال کی کتاب فرماتی ہے کہ "خداوند کا خوف حکمت کا شروع ہے".

جی ٹی مینلی صاحب کی یہ کتاب مسیحی سمنریز میں پڑھائی جاتی ہے لہذا یہ کوئی روایتی پادری کی کتاب نہیں ہے.

پادری برکت اللہ صاحب کی کتاب "صحت کتب مقدسہ" کے نئے ایڈیشن میں یہ سب حوالہ جات خارج کر دیئے گئے ہیں. راقم الحروف کے پاس اس کتاب کا 1952ء کا غیر محرف ایڈیشن موجود ہے جہاں یہ سب اقرار جرم موجود ہیں. یہ حال ہے ان مسیحیوں کی علمیت کا کہ جو پادری ساری زندگی یہ دہائی مچاتے دنیا سے چلا جاتا ہے کہ بائبل میں تحریف نہیں ہوئی اس کے مرنے کے بعد خود اس کی کتاب میں تحریف کر دی جاتی ہے.

لبرل ازم: (liberalism) انفرادی زندگی میں مذہب بیزاری:

لفظ 'لبرل'، قدیم روم کی لاطینی زبان کے لفظ 'لائبیر (Liber)' اور پھر 'لائبرالس (Liberalis)' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "آزاد، جو غلام نہ ہو"۔

پاکستان کی سرکاری اردو لغت (http://udb.gov.pk) میں لفظ لبرل کا مطلب یہ بتایا گیا ہے

"کھلے ذہن کا مالک، وسیع القلب، کشادہ نظر، وہ شخص یا افراد کا گروہ جو انفرادی آزادی، جمہوری نظام حکومت اور آزاد تجارت کا حامی ہو، جاگیر داری اور رجعت پسندی کے مقابل، فیاض، کریم، دریادل، سخی۔"

آٹھویں صدی عیسوی تک اس لفظ کے معنی ایک آزاد آدمی ہی تھا۔ بعد میں یہ لفظ ایک ایسے شخص کے لیے بولا جانے لگا جو فکری طور پر آزاد، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کا مالک ہو۔ اٹھارہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد اس کے معنوں میں خدا یا کسی اور مافوق الفطرت ہستی یا مافوق الفطرت ذرائع سے حاصل ہونے والی تعلیمات سے آزادی بھی شامل کر لی گئی، یعنی اب لبرل سے مراد ایسا شخص لیا جانے لگا جو خدا اور پیغمبروں کی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی پابندی سے خود کو آزاد سمجھتا ہو، اور لبرل اِزم سے مراد اسی آزاد روش پر مبنی وہ فلسفہ و نظام اور اخلاق و سیاست ہوا جس پر کوئی گروہ یا معاشرہ عمل کرے۔ یہ تبدیلی اٹلی سے چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہونے والی تحریکِ احیائے علوم (یعنی Rebirth of Renaissance) کے اثرات یورپ میں پھیلنے سے آئی۔

---

[1] عبدالرحمٰن نواز: ریسرچ سکالر: ادارہ حقوق الناس، ایم فل

برطانوی فلسفی جان لاک (۱۶۲۰۔۱۷۰۴ء) پہلا شخص ہے جس نے لبرل اِزم کو باقاعدہ ایک فلسفہ اور طرزِ فکر کی شکل دی۔ یہ شخص عیسائیت کے مروّجہ عقائد کو نہیں مانتا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ بنی نوعِ انسان کو آدم کے اس گناہ کی سزا ایک منصف خدا کیوں کر دے سکتا ہے جو انھوں نے کیا ہی نہیں۔ عیسائیت کے ایسے عقائد سے اس کی آزادی اس کی ساری فکر پر غالب آگئی اور خدا اور مذہب پیچھے رہ گئے۔ جان لاک جدید لبرل ازم کا بانی ہے، اسی نے ہی اسے سیاست، معیشت، اور سماجی تصورات میں موضوع بنایا- اس سے پہلے لفظ لبرل صرف لبرل آرٹ یعنی فنون لطیفہ میں استعمال ہوتا تھا- لاک کہتا ہے:

”ہر فرد کو اپنی زندگی، آزادی، اور جائیداد پر فطری (و پیدائشی) حق حاصل ہے.. اور گورنمنٹ ایک انتظامی ادارہ ہے جو لوگوں سے ان کی زندگی آزادی جائیداد اور مذہبی حق نہیں چھین سکتی“

انقلاب برطانیہ(Revolution Glorious) ،امریکی انقلاب، اور انقلاب فرانس کو لبرل ازم نے علمی و فکری تحریک دی۔ انقلابِ فرانس کے فکری رہنما والٹئیر (۱۷۷۸ء) اور روسو (۱۷۷۸ء) اگرچہ رسمی طور پر عیسائی تھے مگر فکری طور پر جان لاک سے متاثر تھے۔ انھی لوگوں کی فکر کی روشنی میں انقلابِ فرانس کے بعد فرانس کے قوانین میں مذہبی اقدار سے آزادی کے اختیار کو قانونی تحفّظ دیا گیا اور اسے ریاستی اُمور کی صورت گری کے لیے بنیاد بنا دیا گیا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق امریکا کے اعلانِ آزادی میں بھی شخصی آزادی کی ضمانت جان لاک کی فکر سے متاثر ہو کر دی گئی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں خدا، حیات بعد الموت اور دین اسلام کی دنیاوی امور سے متعلق تعلیمات کے بارے میں آج جو بے اطمینانی پائی جاتی ہے، اس کا سرچشمہ یہی یورپ کی خدا سے برگشتہ فکر ہے جس کی ذرا سخت قسم لبرل اِزم اور کچھ نرم سیکولر اِزم ہے۔ یہ لبرل ازم اور سیکولر ازم ہی ہے جس نے موجودہ دور کے عصری تعلیمی اداروں میں ”تصور وحی کی نفی“ جیسے تعلیمی نظام کو فروغ دینے پر مجبور کیا ہے۔ نتیجتاً ہر خاص وعام، مادیت اور نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو گیا۔

عرف میں لبرل ایک ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو انفرادی آزادی کی بات کرتا ہو، جمہوریت کا حامی ہو، فری ٹریڈ کا حامی ہو، حقوق نسواں کی تحریکوں کو نظریاتی سطح پر جسٹیفائے کرتا ہو اور اشیاء کا جائزہ بالعموم مذہب کی بجائے عقل وخرد کی بنیاد پر کرتا ہو۔

مغربی فکر و فلسفے کے مطالعے سے واضح ہے کہ لبرل ازم ایک جامع اصطلاح ہے جس میں سیکولر ازم، ہیومن ازم اور انہی کے طرح کے دیگر "اِزم” بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ در حقیقت جتنے بھی مغربی "اِزم” ہیں وہ کئی کئی جہات سے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس لئے ان کے درمیان کوئی واضح خط فاصل کھینچنا خاصا مشکل کام ہے۔

جہاں تک ہم لبرل ازم کو سمجھتے ہیں، اس کے مطابق، لبرل ازم اور سیکولر ازم کی تعریف میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے،

"لبرل ازم تنویری مفکرینِ مغرب (Enlightened Western Thinkers) کا پیش کردہ ایک ایسا نظریہ حیات ہے جس کے مطابق انسان کے انفرادی معاملات کو ہدایتِ الٰہی (Religion) سے آزاد فکرِ انسانی (Reasoning) کی اصولوں پر طے کیا جانا چاہئے۔“

آپ نے دیکھا کہ سیکولرازم کا تعلق انسان کے اجتماعی معاملات سے تھا جبکہ لبرل ازم کا تعلق انفرادی معاملات سے ہے۔ لبرل ازم میں درج ذیل تصورات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے :

جمہوریت: اس کے بغیر لبرل ازم قائم ہی نہیں ہوتا اور تاریخ گواہ ہے کہ شہریت کی مساوات کی بنیاد پر جمہوریت کا جنم لبرل نظریات اور تحریک کا نتیجہ ہے۔ تمام افراد کو بلا تفریق یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کے سیاسی انتظام کے لئے اہل قیادت منتخب کر سکیں۔

شہری حقوق: ریاست میں تمام شہری نسل زبان مذہب اور ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر برابر ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ سب سے مساوی برتاؤ کرے۔

آزادی اظہار رائے: میڈیا آزاد ہونا چاہئے کہ وہ شہریوں کی شخصی آزادی کا احترام کرتے ہوئے سیاست معیشت و سماج میں جو دیکھے اسے آئینہ بنا کر دکھا دے۔ اسی طرح شہریوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جس رائے کو بہتر سمجھیں اس کی نشر و اشاعت کر سکیں۔ صرف نفرت پر مبنی تحریر و تقریر (speech Hate) ممنوع ہے۔

حق اجتماع: تمام شہریوں کو حق حاصل ہے کہ سیاست معیشت سماج یا مذہب سے متعلق کوئی تقریب، جلسہ، مجلس، یا کوئی بھی کمیونٹی پروگرام کروا سکتے ہیں، اس میں شرکت کر سکتے ہیں اور اپنے دوستوں و پبلک کو مدعو کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی: مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، ہر فرد کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس مذہب یا نظریہ کو اپنی عقل و بصیرت سے بہتر جانے، اس پر عمل کرے۔ مذہبی آزادی کے بغیر لبرل ازم کی بنیادیں قائم نہیں رہ سکتیں۔

آزاد تجارت و مارکیٹ: ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے خریدے یا بیچے۔ جائیداد رکھنے کا ہر فرد کو حق حاصل ہے۔ ریاست انتظامی اخراجات کے لئے لوگوں سے ٹیکس وصول کر سکتی ہے مگر وہ اس کے خرچ میں جوابدہ ہے۔ ٹیکس کا مصرف محض شہریوں کی فلاح و بہبود اور ملکی دفاع ہونا چاہئے۔

لبرل ازم کا بنیادی نعرہ ہے، "آزادی"، قابل غور بات یہ ہے کہ آزادی سے مغربی مفکرین کی مراد کیا ہے؟ مغربی فکر اور معاشرے میں آزادی ایک بنیادی قدر ہے۔ تمام مغربی فلسفے فرد یا افراد کی آزادی کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ مغربی تصور آزادی سے مراد ہے، "مذہب کی حدود و قیود سے آزادی۔" لبرل ازم کا نصب العین آزادی کو یقینی بنانا ہے، لہذا ضروری ہے کہ ہم آزادی کے مغربی تصور پر روشنی ڈالیں۔

مغربی تصور آزادی یہ ہے کہ "میری خواہشات اور ترجیحات کی تقسیم اور درجہ بندی متعین کرنے کا حتمی اختیار صرف اور صرف میرے پاس ہے، خیر و شر کا حتمی پیمانہ میں ہوں، خدا اور نبی کون ہوتے ہیں جو مجھے بتائیں کہ مجھے کیا چاہئے اور کیا نہیں چاہئے"!

لبرل ازم کی شاخیں:

دین لبرل ازم کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ایک انسان کی زندگی، آزادی اور جائیداد پر فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی دوسرے کو اسے اس حق کے آزادانہ استعمال سے منع کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب اس حق آزادی کی حدود متعین کرنے کی بات آتی ہے. اور یہیں سے لبرل ازم کی شاخیں اور فرقے جنم لیتے ہیں.

کلاسیکل لبرل ازم: یہ آزادی پر زیادہ زور دیتا ہے۔

سوشل لبرل ازم: یہ برابری پر زیادہ زور دیتا ہے۔

لیکن دونوں قانون کی بالادستی کے قائل ہیں. یعنی ریاست کا قانون شخصی آزادی پر فوقیت کا حامل ہوگا. البتہ شخصی آزادی کو قانون کے تحت کرنے کے فلسفے کی مخالفت میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے. ان سب کا بنیادی فرق سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں اس آزادی کی حدود کے تعین پر ہے.

اسی بنیاد پر لبرل ازم میں ایک "بدعت"، "لبر ٹیرئین ازم (Libertarianism) " کے نام سے پیدا ہوئی، اب اس میں تقسیم در تقسیم کے بعد بیسویں اقسام اور فلسفے جڑ پکڑ چکے ہیں. ان میں ایک انتہا پر لبر ٹیرئین ازم کی ایک شاخ "اینارک ازم (Anarchism) " ہے، جو فرد کے معاملات میں ریاست کی کسی بھی قسم کی دخل اندازی کی قائل نہیں. تو دوسری انتہا پر "لبر ٹیرئین سوشلزم" ہے، جس کا مارکس ازم سے واحد فرق یہ ہے کہ معاشی اعتبار سے یہ کیپٹل ازم کا حامی ہے۔

خلاصتاً ہم کہہ سکتے ہیں لبرل بیانیے کے بنیادی نکات یہ ہیں:

1۔ لبرل ازم وحی اور مذہب کو اولاً تو انسان کی انفرادی زندگی سے معطل کرنے اور بعد ازاں ان کے انکار کا نام ہے۔

2۔ لبرل ازم خیر وشر کا پیمانہ خدا اور نبی کی بجائے خود فرد کو قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی بندہ زنا (بدکاری) کرنا پسند کرتا ہے تو کر لے اسے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ خدا اسے ناپسند کرتا ہے کیونکہ خدا کو کوئی حق نہیں کہ وہ میری پرسنل لائف میں انٹرفیئر کرے! (العیاذ باللہ)

3۔ لبرل ازم ہر قسم کی مذہبی تعلیمات اور حدود و قیود کو توڑ کر ان سے آزادی حاصل کر لینے کا نام ہے۔

4۔ لبرل ازم ہر شعبہ ہائے زندگی سے مذہب کو بے دخل کر کے نفسانی خواہشات کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے نظریہ کو بطور نظریہ حق اپنانے یا نافذ کرنے کا نام ہے۔

ہیومنزم(انسانیت)Humanism :

مغربی تہذیب کے اصلی معمار یونانی فلاسفہ بالعموم ہیومن ازم کے داعی تھے۔ جدید مغرب میں جب مذہب کو رد کرنے کا رجحان پیدا ہوا تو اس فلسفے کو نئی زندگی ملی اور اس نعرے کو ہر دلعزیز بنایا گیا کہ ایک انسان کسی خاص مذہب، خدا یا کسی بھی مافوق الفطری نظریات ترک کرکے اپنے موجودہ معاشرے کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھے اور دوسروں کو محض اسی حیثیت سے پرکھے اور ان سے سلوک، تعلق یا معاملہ کرے۔ ان دیکھے نظریات اور رہنمائی کے تصورات کو ایک طرف رکھ کر عالمی سچائی، اخلاقی اقدار وغیرہ کو عقل و منطق کے ذریعے دریافت کرے اور یوں مذہب کے متبادل کے طور پر عقل کے ذریعے ایک جدید قابل عمل اخلاقی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے ہیومن ازم کے نام سے نیا فلسفہ وجود میں آیا۔

جیک گراسبی(Jack Grassby)لکھتا ہے:

Humanist start from the premise that there are no accessible gods. Spirits or non-material souls. There are no supernatural beings to instruct or inform us. There is no transcendent entity, religious or idealogical,that we can turn to for comfort, validation or support[1]

یعنی ہیومن ازم کے پیروکاروں کا بنیادی مقدمہ ہی یہ ہے کہ یہاں کوئی قابل رسائی خدا، روح یا غیر مادی ہستی نہیں۔ یہاں کوئی مافوق الفطرت وجود نہیں جو ہمیں ہدایت دے سکے یا کوئی اطلاع ہی بہم پہنچا سکے اور نہ کوئی ایسی بالاتر ہستی، مذہب یا نظریاتی پائی جاتی ہے جس سے ہم کسی قسم کی تسکین یا کوئی جواز یا حمایت ہی حاصل کر سکیں۔

اسکی ایک اور تعریف ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے:

Humanism is a secular alternative to religion in our quest for a good, moral life. It is a view of life which does not count upon any God, religion or life after death[2]

یعنی ہیومن ازم ایک اچھی اور اخلاقی زندگی کی تلاش میں مذہب کی جگہ لینے والا اس کا متبادل سیکولر طرز زندگی ہے۔ یہ ایک فلسفہ حیات ہے جو کسی خدا، مذہب یا موت کے بعد کسی زندگی کا قائل ہے نہ ان پر انحصار کرتا ہے۔ اس مذہب میں ہمارے وجود کا مقصد اعلیٰ اخلاقی اقدار کے تحت زندگی گزارنا نہیں بلکہ مادی وجود کے ہیجان انگیز احساسات کی بھوک مٹانا ہے۔

Jack Grassby: post-modernism,(p.16)[1]
[2]. *(Thomas W. Clork (1993) Humanism and post-modernism, a Reconciliation*

امریکی فلسفی کارلس لیمنٹ نے اپنی کتاب فلسفہ انسانیت پرستی میں ہیومنزازم کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

صفحہ نمبر 10[1] سے وہ ہیومنزم کے دس بنیادی نکات بیان کرنا شروع کرتا ہے جن میں سے پہلے پانچ کا معنوی ترجمہ مع اصل متن آپ احباب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ آپ خود فرمایئے۔

First, Humanism believes in a naturalistic metaphysics or attitude toward the universe that considers all forms of the supernatural as myth; and that regards Nature as the totality of being and as a constantly changing system of matter and energy which exists independently of any mind or consciousness.

اول، ہیومنزم نیچری مابعد طبیعات یا سادہ لفظوں میں اس رویئے پر یقین رکھتا ہے جس کے مطابق ہر قسم کے مافوق الفطری موجودات (مثلا خدا، فرشتے، جنت، جہنم وغیرہ) فرضی قصے کہانیاں اور افسانے ہیں، اور یہ کہ تمام وجودات اور یہ ساری کائنات، مستقل بالذات مادے اور انرجی کے باہمی تعامل ہی کا نتیجہ ہیں جن کے پیچھے کوئی ذہن مطلق یا ناظم کائنات کارفرما نہیں ہے۔

Second, Humanism, drawing especially upon the laws and facts of science, believes that we human beings are an evolutionary product of the Nature of which we are a part; that the mind is indivisibly conjoined with the functioning of the brain; and that as an inseparable unity of body and personality we can have no conscious survival after death.[2]

دوم، ہیومنزم کا انحصار، بالخصوص سائنسی قوانین و حقائق پر ہے۔ ہیومنزم کے مطابق ہم انسان اس مادی کائنات، جس میں کہ ہم رہتے ہیں، ہی کا ایک حصہ اور ارتقائی ماحصل ہیں۔ اور یہ کہ نفس یا شعور انسانی دماغ ہی کے تعامل اور فنکشنز کا نام ہے جس کا دماغ کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے یعنی نفس انسانی الگ سے کوئی روحانی وجود نہیں بلکہ دماغ ہی کا ایک عمل ہے۔ ہیومنزم اس بات پر بھی یقین رکھنے کا نام ہے کہ چونکہ انسانی تشخص یا روح اور جسم در حقیقت ایک ہی شے ہے اس لئے موت کے بعد کسی قسم کی شعوری حیات کا کوئی وجود نہیں۔

Third, Humanism, having its ultimate faith in humankind, believes that human beings possess the power or potentiality of solving their own problems, though reliance primarily upon reason and scientific method applied with courage and vision.

سوم، ہیومنزم چونکہ "انسان" پر ایمان لانے کا نام ہے، اس لئے انسانی مسائل کو حل کرنے میں حتمی فیصلہ (وحی یا آسمانی ہدایت کی بجائے) انسانی عقل اور سائنسی طریقہ کار کا ہے۔

---

1 اس کا اردو ترجمہ امجد بھٹی نے انسان دوستی کا فلسفہ کے نام سے کیا ہے جسکو فکشن ہاوس لاہور نے شائع کیا ہے

[2] *https://www.corliss-lamont.org/hsmny/whatishumanism.htm*

Fourth, Humanism, in opposition to all theories of universal determinism, fatalism, or predestination, believes that human beings, while conditioned by the past, possess genuine freedom of creative choice and action, and are, within certain objective limits, the shapers of their own destiny.

چہارم، ہر قسم کے نظریہ جبر و تقدیر اور ایمان بالقدر کے بر عکس، ہیومنزم یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان اپنی قسمت اور تقدیر کا خالق خود ہے، ان معنوں میں کہ جس شے یا عمل کو انسان مثبت سمجھتا ہے، اسے اپنانے یا کر گزرنے میں انسان پوری طرح آزاد ہے۔یعنی اسے کسی خارجی یا آسمانی پابندی کی فکر نہیں کرنے چاہیئے، وہ اپنے لئے خیر و شر کے انتخاب اور ترجیحات کی درجہ بندی متعین کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔

Fifth, Humanism believes in an ethics or morality that grounds all human values in this-earthly experiences and relationships and that holds as its highest goal the this worldly happiness, freedom, and progress – economic, cultural, and ethical – of all humankind, irrespective of nation, race, or religion.

پانچواں یہ کہ ہیومنزم کے مطابق اخلاقیات کی تمام تر بنیاد مذہب، قوم یا قبیلے کی روایات و تعلیمات کی بجائے ان دنیاوی اقدار پر ہے جن کے ذریعے انسان اس دنیامیں زیادہ سے زیادہ خوشیاں، آزادی اور مادی ترقی حاصل کر سکے۔

کارلس لیمنٹ نے یہ بات کھول کر بیان کر دی ہے کہ ہیومنزم یعنی انسانیت پرستی، خدا پرستی یا مذہب کے عین الٹ ہے۔۔ ہیومن ازم مذہب کے متوازی ایک مکمل مذہب ہے۔ایک ایسا مذہب جس میں انسان کی پرستش کی جاتی ہے۔ پس ہیومنزم کا بنیادی کلمہ "لاالہ الا الانسان ہے، آپ نے اکثر سنا ہو گا کہ "انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے، یہ جملہ اسی فکر کا پرچار کرتا ہے۔

اس نئے مذہب نے جس عملی نظام کی بنیاد رکھی اس کو جدیدیت (Modernism) کے نام سے موسوم کیا گیا[1]

---

[1] ماہنامہ الشریعہ (۴۴) نومبر ۲۰۱۴، تہذیب مغرب: فلسفہ ونتائج، محمد انور عباسی

اکابرین کے اٹھتے جنازے اور ہماری موجودہ ذمہ داریاں

نازش المدنی مراد آبادی: خادم التدریس جامعۃ المدینہ باسنی ناگور (راجستھان)

؎ مقدور ہوں تو خاک سے پوچھوں کے اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

موجودہ صدی یقیناً قحط الرجال صدی ہے اور موجودہ صدی میں بھی دور حاضر انتہائی افسوس کن ہے کیونکہ اس صدی میں جتنے علمائے اس دنیا سے کوچ کئے ہیں شاید ہی اس سے قبل کسی صدی میں اتنی بھاری تعداد علماء و مشائخ کی کوچ کی ہو۔ چودہ سو سال پہلے جس غیب داں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یقبض العلم بقبض العلماء[1] یعنی علم کو علماء کی روح قبض کر کے اٹھالیا جائے گا وہ بالیقیں اس دور میں پورے طور پہ صادق آرہا ہے کہ علماء و مشائخ عظام رحمہم اللہ السلام کی ایک بھاری تعداد انتقال کرتی چلی جارہی ہے آپ ماضی قریب میں قبلہ تاج الشریعہ قدس سرہ کے وصال کے بعد ذرہ دیکھیں کیسے کیسے علم و فضل کے کوہ گراں اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے ایک کا غم و الم ماندہ نہیں پڑتا کہ دوسرے کی خبر ارتحال آ پہنچتی ہے

آہ اہلسنت کی یتیمی پہ رونا آرہا ہے کہ کیسے کیسے نیر تاباں ہمارے درمیان سے روپوش ہوتے جارہے ہیں پھر المیہ بر آں یہ ہے کہ جو جارہا ہے وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر جارہا ہے اور یہ خلا حالات حاضرہ کو دیکھ کر پر ہوتا ہوا نظر بھی نہیں آرہی (لیکن اللہ جل مجدہ الکریم قادر مطلق ہے کہ ان کے امثال پیدا کر دے) ہر طرف شور و غوغہ کہیں سکون و یکسوئی نہیں کہیں آپسی اختلاف تو کہیں مشربی اختلاف ہر طرف فتنہ ہی فتنہ جسے دیکھو فروعی مسائل کے اختلاف کے سبب آپس میں دست و گریباں ہے اہلسنت کا شیرازہ بکھرتا چلا جارہا ہے کسی کو کوئی فکر نہیں سب اپنی دوکان داری چمکانے میں لگے ہوئے ہیں شاید انہیں حالات کو دیکھتے ہوئے میرے مرشد گرامی قبلہ امیر اہلسنت نے فرمایا تھا کہ "آئندہ نسلوں میں مجھے کم ہی جید علماء دیکھنے کو ملیں" علماء و مشائخ عظام کے یہ اٹھتے جنازہ ہمیں یہ پیغامِ عمل دے رہیں ہیں کہ ہم تو جارہے ہیں لیکن تم خود کو اور آئندہ نسلوں کو علم و عمل کے لحاظ سے مضبوط رکھنا اے کاش ہمیں اپنے بزرگوں کی قدر نصیب ہوتی بہر حال افسوس ہی کیا سکتا ہے مگر افسوس کرنے

---

[1] بخاری ج اول ص20

سے کیا ہوتا ہے زندگی عمل سے بنتی ہے لہذا ہمیں چاہیے کہ آئندہ کے لئے کوئی لائحہ عمل اختیار کریں اور اپنے اکابر کے مشن کے فروغ کے لئے آگے بڑھیں۔

اکابر و مشائخ اہلسنّت کے مشن کو فروغ کے سلسلہ میں ہماری کیا ذمہ داریاں ہونی چاہیے ان میں کچھ امور کو نیچے ذکر کیا جاتا ہے جن پر عمل کی صورت میں کافی حد تک بہتری آسکتی ہے:

- ✓ مشربی اور آپسی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر اتفاق و اتحاد کا ماحول پیدا کیا جائے کسی سے اگر کوئی شرعی غلطی ہو رہی ہے تو ہر بندہ فتوی صادر کرنے سے بچے بلکہ اس کے لئے معتمد و مستند مفتیان کرام کی ایک متحدہ مجلس تشکیل دی جائے پھر اس پہ سب مفتیان کرام صاحب مسئلہ کو طلب کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش فرمائیں اور جو فتوی لگائیں متفقہ اور اجتماعی ہو یہ نہ ہو کہ ہر دارالافتاء سے الگ الگ آراء قائم ہوں کیونکہ ایسی صورتحال میں عوام بے چاری شش و پنج کا شکار ہو جائے گی کہ کرے تو کیا کرے کہ ایک ہی بندہ کے بارے میں فلاں کا یہ موقف ہے فلاں کا یہ عمل کریں تو کس رائے پہ کریں
- ✓ خانقاہوں میں جو علم و عمل کا انحطاط و فقدان ہے اور رسمیں باقی رہ گئی ہیں اس کے تدارک کے لیے خانقاہوں میں مدارس کا قیام ہو اور مریدین و معتقدین کی علم و عمل دونوں لحاظ سے بھرپور تربیت کی جائے۔
- ✓ مکاتب و مدارس اسلامیہ میں اساتذہ کرام کے وظیفے خاطر خواہ ہوں اس لیے کہ اساتذہ جب معاشی لحاظ سے مطمئن ہوں گے تو دین کی خدمت بھی اچھے انداز میں کر سکیں گے نیز طلبہ کرام کو ہر طرح سے سہولت فراہم کی جائیں غریب طلبہ کو وظیفہ بھی دیے جائیں اور تربیت پہ خاص توجہ دی جائے
- ✓ جلسوں جلوسوں میں مقررین و خطباء رد و ابطال عقائد باطلہ کے ساتھ ساتھ عقائد و معمولات اہلسنت (خاص طور پہ دور حاضر کے عظیم فتنہ رافضیت منکرین حدیث و فتنہ الحاد سے عوام اہلسنت کو آگاہ کیا جائے) اور اصلاح اعمال پہ بھی خاص توجہ دیں۔
- ✓ ائمہ و موذنین مساجد کے وظیفوں میں اضافہ کیا جائے۔
- ✓ نوخیز اصحاب قلم کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ بڑھ چڑھ کر مزید دین کا کام کریں۔
- ✓ جگہ جگہ لائبریری اور دار المطالعہ کا قیام کیا جائے اور عوام کو دین پڑھنے طرف توجہ دلائی جائے۔
- ✓ مدارس و کالجز میں جاکر طلبہ و اسٹوڈینٹ کی ذہن سازی کی جائے اور علم و عمل کا ذوق پیدا کیا جائے تاکہ متحرک و فعال افراد تیار ہوں جو تندہی کے ساتھ خدمت دین سر انجام دین سکیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کردے

آئے دن اخبارات کی زینت وہی خبریں ہوتی ہیں جن سے اسلام اور تعلیمات اسلام مجروح ومبذول ہوں، تعلیمات اسلام کو نظر انداز کرنے اور ان سے منحرف ہونے کے جرم میں وہی ہوتا ہے جس کی پیشن گوئی اقبال نے کیا تھا:

آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر خام تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

آج ہم بلند افکار سے مراد فرنگی تہذیب وتمدن کو سمجھتے ہیں، فرنگی ویورپی تہذیب وتمدن بالکلیہ اسلامی تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن وثقافت کے برعکس وبرخلاف ہے۔ عورتوں کی عزت، عفت، عصمت، تعظیم وتوقیر سوائے اسلام کے کوئی نہیں کرتا اور نہ حکم دیتا ہے بلکہ دشمن عناصر اوصاف نسواں کو پامال کرنے میں کوشاں ہیں، نوجوان لڑکیاں عشق مجازی اور طمع کی بنیاد (مال کی لالچ) پر جتنی تیزی سے بگڑ رہی ہیں، اور تعلیمات اسلام کو بھلا کر نظام اسلام کو پامال کر رہی ہیں، ہائے افسوس!

ہماری پاکیزہ بہنیں ببانگ دھل اور آزادانہ طرز پر کفر (اغیار) کے بستر کی زینت وآرائش بن رہی ہیں۔ بتائیں ان سب کا ذمہ دار کون ہیں؟

خود لڑکیاں　　کفر (کفار)　　فرنگی تہذیب　　معاشرہ　　نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم　　یا والدین

ہلکا سا تفکر و تدبر سے عقل یہ بات قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گی کہ ان تمام بے حیائی، بد فعلی، اور بے پردگی کے ذمہ دار والدین کے علاوہ کوئی نہیں۔

آقا و مولی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری حدیث پاک ہے:

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فأبواہ یہودانہ او نصرانہ او یمجسانہ[1]

(ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)

اس حدیث پاک کے اشارۃ النص سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آج نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے زوال کا ذمہ دار والدین ہیں، اگر والدین اپنی اولاد کی تربیت، تعلیمات اسلام اور نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق کرتے تو یہ وقت دیکھنے کو نہ ملتا، والدین کا حال یہ ہے کہ خود اپنی بیٹیوں کو میک اپ اور پرکشش جاذب نظر کپڑے پہنا کر کالج و اسکول روانہ کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، لیکن انہیں علم نہیں کہ ان کی بچیاں گھر سے نکل کر کالج و اسکول جاتی ہیں یا پھر کہیں اور؟

ان جیسے والدین اور لڑکیوں کے سبب گھر تو گھر بلکہ پورا معاشرہ ناپاک و فساد ہو جاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال اپنی حیات ظاہری ہی میں موجودہ حالات کا مشاہدہ کر چکے تھے، اور پیش گوئی فرمادی کہ ایک وقت یورپ اپنی فرنگی تہذیب پوری دنیا میں اس طرز پر پھیلائے گی کہ ہر طرف برائی ہی برائی نظر آئے گی۔ اس یورپی تہذیب نے قلب کو مردہ، نظر کو اندھا، معاشرہ کی پاک روح کو ناپاک، اسلام کی مقدس شہزادیوں کی عصمت دری، ضمیر پاک کو ناپاک، خیال بلند کو پست، ذوق لطیف کو ناپید کر کے رکھ دیا۔

اے اسلام کے گلشن میں پروان چڑھنی والی مقدس شہزادیاں! جان کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تمہاری حالت کتنی نازک تھی؟ کبھی تم نے غور کیا کہ یہ عزت کس کی بدولت ملی؟ یہ وقار کس کے ظہور سے ملا؟ یہ تعظیم و توقیر کہاں سے حاصل ہوئی؟

یقینا یہ عزت یہ وقار یہ تعظیم و توقیر اسی محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس در سے حاصل ہوئی۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے کیا ہی خوب فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم: حدیث نمبر: 6755

؎وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے

غبار راہ کو بخشا فروغ وادئ سینا

اے اسلام کے خوشبودار پھولو! تم غبار کی زینت بن رہی تھی، تم زندہ درگور کی جارہی تھی، جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی کو روشن کرنے لیے تشریف لائے اور نازک معاملات کو ملاحظہ فرمایا تو تمہاری فضیلت بیان فرمائی، فرمایا:

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَيُّوبَ بْنِ بَشِيرٍ، عَنْ سَعِيدٍ الْأَعْشَى، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ كَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، أَوْ ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ، أَوِ ابْنَتَانِ، أَوْ أُخْتَانِ، فَأَحْسَنَ صُحْبَتَهُنَّ، وَاتَّقَى اللَّهَ فِيهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ[1]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کے پاس تین لڑکیاں، یا تین بہنیں، یا دو لڑکیاں، یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کے حقوق کے سلسلے میں اللہ سے ڈرے تو اس کے لیے جنت ہے)

اسلامی بہنوں کا راہ راست سے منحرف ہونے کی کئی وجوہات ہے، جس میں بنیادی وجہ بے پردگی و بے حیائی ہے، ہم بازار سے ایک کیلو گوشت خرید کر بحفاظت گھر لاتے ہیں، لیکن اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ڈیڑھ من لاش کو کتوں کے سامنے پھینک دیتے ہیں، یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ تمہاری بچیوں کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھانے کے لیے دشمن عناصر کے ہزارہا کتے بھوکے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھوک تمہاری بیوی اور بچیوں کے ذریعے مٹائے، اسی لیے پانی سر سے تجاوز کرنے سے پہلے پہلے اس پانی کے راستے کو ہی بند کر دیں۔

اپنی لڑکیوں کو اسکول، کالج، محلے اور بازاروں کی زینت بننے سے بچائیں، تعلیمات اسلام سے آگاہ کریں، اللہ واحد قہار کا خوف بٹھائیں، عشق رسول کی داستان سنائیں، الغرض اسلامی تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں، ورنہ تمہاری یہی اولاد مصیبت وپریشانی اور خودکشی کی وجہ بن سکتی ہیں۔ کبھی بھی یورپی اور فرنگی تہذیب کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہ دیں، بلکہ تعلیمات اسلام اور نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس جامہ زیب تن کرلیں اور کر دیں۔

؎خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ

سرمہ ہے مری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

---

[1] سنن ترمذی: حدیث 1916
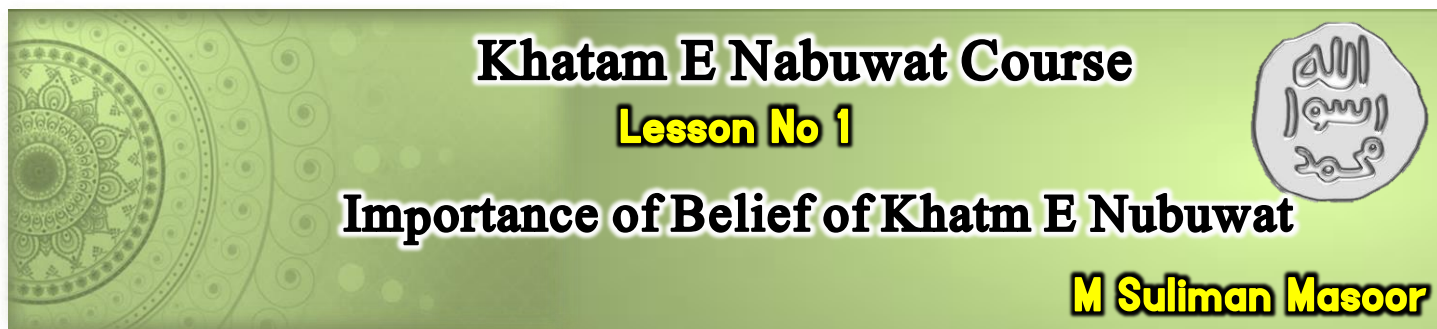
khatm_e_nubuwat:

Allah started the chain of Prophethood from Hazrat Adam Alaih-i-Salam and it ended with the Holy Prophet Muhammad SallAllah-o-Alaihi WA Aalihi Wasallam. Muhammad SallAllah-o-Alaihi WA Aalihi Wasallam is the last Prophet. There will be no Prophet after him. In the terminology of Shariah (Islamic law) having this faith is called the "Faith in Khatm-e-Nubuwwat."

Belief in Khatm-e-Nubuwwat is one of the basic and important article of faith. From the Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam's time to this day every Muslim has the belief that Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam is the last Prophet of God without any doubt.

The significance of khatme_Nabuwat:

Islam enjoins upon the faithful a solid belief in the divine decree of Khatme-Nabuwwat (Finality of Prophethood) in last of the Messengers and the mercy to the Universe, hazrat Muhammad (salullahu alaih wassalam) . This tenant of Islam is so essential that the slightest doubt in its validity may bring one's faith to ruin. Those who guard their belief in this basic doctrine are surely protecting their faith in the religion of Allah Almighty.

Individuals who believe in the possibility of new Prophets after hazrat Muhammad (salullahu alaih wassalam) are, in effect, advancing the notion that the religion of Allah Almighty is not perfect and are attempting to open the door for the possible alteration, corruption, or rejection of the message of Islam. Mirza Ghulam Qadiani of

---

[1] *Mohammad Suliman Masoor:Islamic Scholar: Shubban Khatam e Nabuwat*

India, for instance, abrogated Jihad, introduced his own novel interpretation of Quranic verses (in defiance to authentic Hadith), and gave birth to a new faith he called 'Ahmadiyyat'. Hussain Ali (Bahaullah) of Iran modified the entire doctrine of Islam, replaced the Holy Quran with his own book, changed the direction of Qibla from Makkah al Mukarrama to Namka in Israel, and named this new faith 'Bahaism.' It should be evident how the mere rejection of the doctrine of Khatme-Nabuwwat enabled misguided or opportunist individuals to challenge the believers from within and divert unsuspecting public from the religion of Allah Almighty.

The Holy Quran has made it abundantly clear, in more than one hundred of its verses, that no new Prophet or prophetic revelation will be sent. Over two hundred hadith (sayings of the holy Prophet (salullahu alaih wassalam)) further support this injunction of the Quranic Message. The Holy Quran, hadith and Tafseer have been consistent on this point since the advent of Islam. In addition, close companions of the holy Prophet, great scholars, and the entire Ummah have agreed on this basic tenant and consider it Kufr to entertain the possibility of Allah Almighty commissioning any other Prophet.

The great Imam and founder of the Hanifa School of thought, Imam Abu Hanifa (razil Allah hu anhu) , was so certain of this view that he decreed the very act of questioning a claimant (demanding proof or miracles) to be an act of disbelief in itself. Naturally, this fatwa was issued to stress the importance of an absolute belief in the Finality of Prophethood and to encourage all Muslims to defend this doctrine from corruption for all times.

Any Muslim would shrink from asking a claimant to divinity for proof; that claim very clearly contradicts the teachings of Islam. The very same level of confidence and belief is also required when we are faced with impostor prophets and Messiahs:

There can not be another god besides Allah Almighty and there can not be another prophet after Muhammad (Salullahu alaih wassalam)

Our duty to defend this basic tenant becomes evident when we review some of the brightest moments in Islamic history. The first rightly guided Caliph, Hazrat Abu Bakr (razil Allah hu anhu) , fought against the army of the impostor prophet Musailma, the Liar, despite the fact that, not only Musailma had recognized the

Prophethood of Muhammad (salullahu alaih wassalam) , but also the Muslim state was still in its infancy and without the needed resources. As the result of this war, 22000 soldiers of Musailma were eliminated; however, approximately 1200 precious Muslim lives -- including almost 600 Huffaz, Qaris, distinguished soldiers of Badr, and close Companions of the Holy Prophet (salullahu alaih wassalam) -- were also lost.

To appreciate these figures and understand the determination of early Muslims to protect the religion of Allah Almighty from possible corruption, we will need to remember that, during the entire life of Rasool Allah (salullahu alaih wassalam) , only 259 Muslim lives were lost in all the battles against the Kuffar. The non-believers had themselves suffered only 759 casualties. In short, our first Caliph, in unison with all the Companions (Sahaba), decreed that the impostor Prophet and his followers should not be allowed to spread their evil. Indeed, none of the companions rested until the complete elimination of the self proclaimed prophet and his followers. This decision of Hazrat Abu Bakr (razil Allah hu anhu) was so highly regarded, endorsed and accepted by the companions, that Hazrat Umar (razil Allah hu anhu) proposed an exchange with Hazrat Abu Bakr (razil Allah hu anhu) . He said:

"I will exchange all good deeds of my life time for your acts of one night and one day. One night from those three nights you spent with Rasool Allah (salullahu alaih wassalam) in the Cave of Thaur and one day from the days of battles against impostor prophets to guard the Finality of Muhammad (salullahu alaih wassalam)

Obviously, defending the Finality of Rasool Allah SAW It is a sad turn of events that some of our Muslim brothers, who claim to be liberal and broad minded, trivialize the significance and importance of the Islamic principal of Khatme-Nabuwwat and do not appreciate our duty to protect the Deen of Allah Almighty from all enemies. We hope that this brief message has helped them realize the true message of Allah Almighty.

With Allah is Success and Peace of Allah be upon his Messenger Muhammad and his Followers and Companions.

Importance of Belief of Khatm_e_Nubuwat:

Belief in Khatm-e-Nubuwwat is one of the basic and important article of faith. From the Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam's time to this day every Muslim has the belief that Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam is the last Prophet of God without any doubt. There are more than one hundred Ayahs of Holy Quran and more than 200 hundred Hadiths that explains that Holy Prophet Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasalam is the last of all Prophets and there will be no Prophet (Nabi or Rasool) after him in any form or in any interpretation.

So, Hazrat Maulana Syed Muhammad Anwar Shah Kashmiri (Rahmatullah Alaih) writes in his last book "Khatm-e-Nubuwwat" that:

"And the first ever consensus of Muslim opinion was the consensus on the murder of Muslima Kazab. Its only reason was just his claim of Prophethood. The reverend Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa Razu An) came to know about his other evil doings later, as Ibne Khuldoon writes. And ages after ages there was always consensus on the infidelity, apostasy and killing of the claimer of Prophethood, and there was never debate on Nubuwwat Tashria or non-Tashria.[1]"

Hazrat Maulana Muhammad Idrees Kandhlvi (Rahmatullah Alaih) writes in "Mark-al-Khasam Fe Khatm-e-Nubuwwat Syed-ul-Nam SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam' that "The first consensus of Muslim opinion occurred on the issue that the claimer of Prophethood be killed[2]"

In all the battles that were fought for the safety of Islam during the life of Hazrat Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam only 259 Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa Razu Anh) were martyred[3] while in the first battle in Islamic history that was fought, in the reign of Hazrat Siddiq Akbar Razi Allah-o-Anho for the safety of Khatm-e-Nubuwwat faith 1200 Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa)[4]

---

[1] *Khatam-un-Nabiyeen P.67. Translation P.197*
[2] *Ehtasab Qadianiyat v. 2 p.10*
[3] *Rahmatal-il-Aalameen v.2 p.213. By Qazi Salman Mansoor Puri (Rahmatullah Alaih)*
[4] *Khatm-e-Nubuwwat Kamil p.304 part 3 by Mufti Muhammad Shafi*

The major assets of the Holy Prophet’s life were these valuable Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa Razu An), who gave their lives for the safety of this faith. This highlights the importance of Khatm-e-Nubuwwat faith. In the following is the account of the martyrdom of on of these Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa Razu An) , Hazrat Habeeb bin Zain Ansari Khazraji Razi Allah-o-Anho:

The Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam sent Hazrat Habeeb bin Zaid Ansari Razi Allah-o-Anho to Muslima Kazab, who belonged to Banu Haneefa tribe of Yamama. Muslima Kazab asked Hazrat Habeeb Razi Allah-o-Anho “do you testify it that Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam is the messenger of God?” Hazrat Habeeb Razi Allah-o-Anho replied, “Yes”. He further asked “do you testify it that I am also the messenger of God?” Hazrat Habeeb Razi Allah-o-Anho replied that “I am deaf. I cannot hear you”. Muslima continued to ask the question again and again and his reply was always the same. Muslima cut the parts of his body one by one. At last Hazrat Habeeb Bin Zaid’s Razi Allah-o-Anho whole body was cut into pieces and he was martyred.”
It shows that how the Sahaba (Razi Allah-o-Anhum Wa Razu Anh) were touchy in the matter of Khatm-e-Nubuwwat. There is another account of one of the Tabaeen (successors to the Holy Prophet’s SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam companions)”“Hazrat Abu Muslim Khulani (Razi Allah-o-Anho) whose real name is Abdullah bin Thob, is that holy man for whom God made fire ineffective, as was the case with Hazrat Ibrahim Alaih-i-Salam that fire set by Namrood became flowers for Ibrahim Alaih-i-Salam. He was born in Yemen. He accepted Islam during Holy Prophet’s SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam lifetime, but he could not get the opportunity to be present before the Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam. In the last days of Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam there appeared a false claimer of Prophethood (Aswad Ansi) in Yeman. He forced people to believe in him. He also sent for Hazrat Abu Muslim Khulani Razi Allah-o-Anho and asked him to believe in his Prophethood. Hazrat Abu Muslim did not accept it. He asked, ‘do you have faith in the Prophethood of Muhammad SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam’? Hazrat Abu Muslim replied in the affirmative. At this Aswad

Ansi set a horrible fire and put Hazrat Abu Muslim (Razi Allah-o-Anho) in it. But God made the fire ineffective and he came out of it without any harm. The incident was so strange that Aswad Ansi and his companions were bewildered. His friends suggested him 'to banish him, otherwise your followers will have no faith in you'. So, he was banished from Yeman. After leaving Yeman, there was only one refugee, Medina. So he set off with the intention of meeting the Holy Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam. But when he reached Medina he came to know the Holy

Prophet SallAllah-o-Alaihi Wa Aalihi Wasallam has passed away. Now Hazrat Abu Bakr Siddiq (Razi Allah-o-Anho) was the caliph. Hazrat Abu Muslim (Razi Allah-o-Anho) started saying prayer behind pillar in Masjid-e-Nabvi. Hazrat Umar (Razi Allah-o-Anho) was sitting there. When he saw a stranger saying prayer, he came near him. After he said prayer, Hazrat Umar (Razi Allah-o-Anho) asked him "from where you have come?" 'From Yeman' he replied. Hazrat Umar (Razi Allah-o-Anho) at once asked, 'God's enemy (Aswad Ansi) put our friend into fire and the fire had no effect on him. How Aswad Ansi treated him afterwards? Hazrat Abu Muslim (Razi Allah-o-Anho) said, 'his name is Abdullah bin Thob'. Hazrat Umar's intelligence at once worked and he asked, 'I put you under oath to tell me whether you are not the same person?' Hazrat Abu Muslim (Razi Allah-o-Anho) replied, 'yes'. In love and happiness he kissed his forehead and took him to Hazrat Abu Bakr (Razi Allah-o-Anho) and made him sit between Hazrat Abu Bakr (Razi Allah-o-Anho) and himself. Hazrat Umar (Razi Allah-o-Anho) said 'thanks God that before my death God gave me the opportunity to see the person to whom Allah Almighty treated like Hazrat Ibrahim. (Alaih-e-Salam)[1]

[1] *Hulya tul Aulya p.129 v.2*
Tehzeb v.6 p.458.
Tarekh Ibn Asaker p.315 v.7
Jehan Deeda p.293
Terjuman-us-Sunnah p.341, v.4
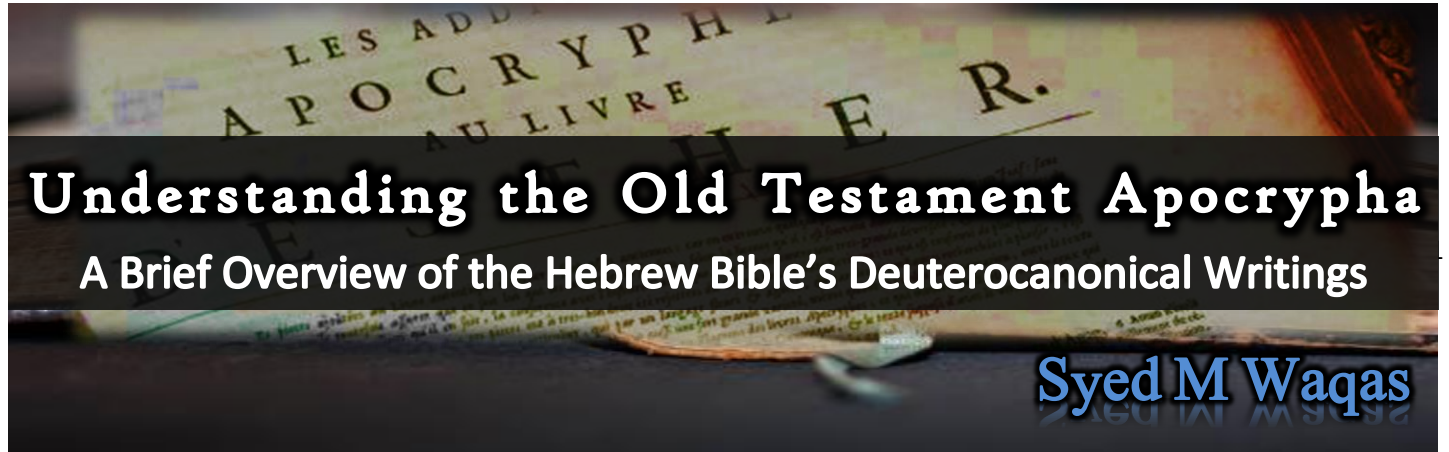
Abstract

The Hebrew Bible Apocrypha is an important segment of the scriptural history of Judeo Christian religion. In this short article, I will review the Apocrypha, its historical background, factors involved in its exclusion from the Bible, and the canons of various church traditions that recognize the Apocrypha as part of their Bible. I will attempt to show in the coming pages that the apocryphal literature continues to assert influence on the Christian world despite controversies and debates surrounding these books' questionable canonical status. It is important to understand that the history of sacred writings in the Judeo-Christian religion cannot be complete without analyzing and understanding the role of the Apocrypha within the grand scheme of biblical literature that accommodates sacred scriptures. The apocryphal books may be either sacred or secular in their nature of origin and content, but they do indeed tap into the sacred biblical stream of consciousness and thus find themselves a niche within the Hagiographa of the Jewish and Christian traditions, which many still hold sacred.

Keywords:

Apocrypha, Deuterocanonical, Septuagint, Hebrew Bible, Maccabees, Canon, Proto-Canon, Ethiopian Orthodox Church, Jamnia Council, Vulgate, Josephus

---

[1] *Syed M Waqas:Researcher at BAB-UL-ILM RESEARCH FOUNDATION (BIRF)*

Introduction to the Apocrypha:

The Apocrypha[1] in the Bible represents a collection of ancient writings composed prior to the Christian New Testament age that are considered controversial in terms of their biblical status among both Jews and Christians. These writings are sometimes found in certain editions of the Bible in a separate section between the Old Testament and the New Testament. They are called the "Apocrypha" due to their allegedly questionable status that bars them from getting accepted into the universally acknowledged canon of the Bible. In some cases the Apocrypha is added as an appendix to the canonical books of the Bible after the New Testament only to demarcate its lesser status. On the other hand, various church traditions, whereof the majority are based in the Catholic and the Orthodox traditions, acknowledge these writings as authoritative and include some or all of the texts of the Hebrew Apocrypha within the body of their versions of the Old Testament. The Protestant denominations, however, across the board, exclude the apocryphal texts from their canon of the Bible and do not acknowledge their authority as the word of God.

The English term *apocrypha* is derived from the Greek word *ἀπόκρυφος*, which means "hidden" or "hidden things."[2] The word apocrypha has no other usage in the theological dictionary, because it is a specifically coined term that is exclusively meant to refer to such books of the ancient Bible that are considered "scripture" by the Roman Catholic and Orthodox Churches while the Protestants dispute their canonicity and authority. The Roman Catholic Church does not address this particular set of books with what appears to be a less respectable title, the Apocrypha; instead, they attempt to enshrine the authority of these books by branding them as the *Deuterocanonical* or the "second canon" books. Such a title, nevertheless, seems to acknowledge the fact that they were added later in history to the canon of the

---

[1] *The word Apocrypha represents the entire collection of books considered apocryphal and thus it is treated as a singular noun in this article. Some writers, nevertheless, do view Apocrypha as plural.*

[2] *Michael D. Coogan et al., eds., The New Oxford Annotated Apocrypha: New Revised Standard Version (New York, NY: Oxford University Press, 2018), 3.*

scriptures or they were, at least, not on a par with the other books of the Bible.[1] It also confirms that the Catholic Church does indeed accept their belated inclusion into the canon of the Bible that results in granting them a secondary status.

It is not historically established how the phrase ‘apocryphal books’ came to be recognized and practiced in the Church. Apocryphal scholars, such as Zahn, Schurer, Porter, and Schmidt, however, agree that the term in question took birth in the period of Late Hebrew.[2] Hebrew word *ganaz* is the origin of the term *ganaz'im* meaning “hidden,” which, according to the tradition, represents the hidden books of the Bible. It is nonetheless interesting to note that the much more inclusive and eclectic Talmud does not make any references to this category of the sacred books of the Jews.[3] Such a complete absence of a reference to the apocryphal books in the Talmud can, in fact, amount to defying and denying a connection between the Hebrew language and the word in question, apocrypha.

Another school of thought suggests that the term apocrypha was coined by Jerome, the father of the Vulgate Bible in the Latin language.[4] Since he discovered those books being read in the Church as the second canon, as they were commonly referred to among early Christians, he declared that they were the hidden books of the Bible that were neither part of the Old Testament nor that of the New Testament. The Protestant denominations have, therefore, always preferred to address this set of books as the Apocrypha due to the dubiousness of their provenance and a lack of historical evidence to support their inclusion in the canon.[5] Moreover, we should bear in mind that the term in question carries little significance in the Catholic and Orthodox churches, for the ordinary worshippers in the pews barely understand the meaning and context of the word Apocrypha when it is spoken to them out loud. Most members of the Catholic and Orthodox churches, *prima facie*, regard the

---

[1] *Don Stewart, “What is the Old Testament Apocrypha?”, Blue Letter Bible (Retrieved on 3-12-2018 - https://www.blueletterbible.org/faq/don_stewart/don_stewart_391.cfm)*
[2] *R.H. Charles, The Apocrypha and Pseudepigrapha of the Old Testament (vol. 1, Berkley, CA: The Apocryphile Press, 2004), vii.*
[3] *Charles, Apocypha, vii-viii.*
[4] *E.E. W., Outlines of the Old Testament Study, Historical and Critical (London, UK: Oxford, 1883), 42.*
[5] *E. W., Outlines, 42.*

deuterocanonical books—the main books in the Apocrypha—as a standard part of the Bible and hence authoritative scriptures in their own right.

The so-called Jewish Council of Jamnia, CE 90, served as the touchstone for the recognition of the Old Testament canon among the founders of the Reformation Movement that gave birth to Protestant Christianity. Apart from the fact that the early Church recognized the accepted Old Testament books as canonical and configured current biblical canon by conscientiously assigning credibility to those books under a consensus, the more palatable and concrete verdict of history to the canon of Hebrew Bible still comes from the first Jewish Council of Jamnia.[1]

The Greek *Septuagint*, on the other hand, cast a confounding shadow on the exact number of the Hebrew Bible books. It had at least three books in its canon that were additional to the present canon—Maccabees I and II being treated as one book. These books were read and quoted among the Jews as well as Christians of early centuries, especially in the Greek speaking communities, as part of the scriptures. The problem of Apocrypha, as it turns out, originally emerged in the Septuagint version of the Hebrew Bible, which handed down the apocryphal fallacy as an ingredient of the scriptural heritage to the coming generations.

Another crucial area for scholarly attention is the numerical difference of the apocryphal books that exists between the Septuagint and the Catholic Bible. Unlike the Septuagint that includes only four apocryphal books, the Roman Catholic Bible accepts seven additional books as part of the Old Testament canon. The main riddle, therefore, has to do with the question as to how those three additional books made into the Catholic Bible, which could not previously secure room in the Septuagint. The Jews originally found this problem prevalent in the Rabbinic Judaism by the first century of the Common Era and therefore effectively dealt with it in the consecutive Jamnia Councils, in CE 90 and CE 118, by closing the canon.[2] The Roman Catholic Church, however, did not follow the historical Jewish edict on the subject of the canon and the ejection of the Apocrypha.

---

[1] *More discussion will unfold in the pages to follow under the heading "the Apocrypha Books."*
[2] *Roger T. Beckwith, The Old Testament Canon of the New Testament Church (Eugene, OR: Wipf and Stock Publishers, 1985), 274.*

The Apocrypha Books:

The uncontroversial canon of what is the universally acknowledged Old Testament is, by and large, the same for the major umbrella churches within Christendom, such as the Protestant, Catholic, and Orthodox churches. This *agreed-upon* Old Testament canon consists of a set of 39 books that are arranged differently in the Christian Bible from the original Jewish arrangement of 24 books found in the *Tanakh*. There is little controversy over the canonicity of these original 39 books of the Old Testament even among the most mutually belligerent groups of Christianity. It is, however, important to note that the Jewish Bible contains only 24 books, as mentioned above, whereas the same *Tanakh* of the Jews is rebranded as the "Old Testament" among the Christians and thus it is rearranged into 39 books.

We must do well to bear in mind that this apparent dichotomy does not, in fact, represent a contradiction or a digression from the historical path of the Jews. The reason why there is a difference in the number of books is that the Christian Old Testament follows a different organizational structure for the same books that Jews revere as God's word. The Book of Samuel, for instance, is not divided into two volumes in the Hebrew canon, whereas the Christian Old Testament divides the same book into Samuel 1 and Samuel 2 due to the book's extraordinary length. Similarly, the twelve books included in the category of "Minor Prophets" are all abridged together under one title in a single volume in the Hebrew Bible. Contrarily, all of these twelve books appear individually under their unique titles in the Christian Old Testament.[1] The Jews refer to the books of the twelve Minor Prophets as the "Book of the Twelve" and recognize them as a unity in one book.[2] The Christians do not follow this practice.

The Jewish canonization of their Bible is said to have come about in the year 90 of the Common Era in the Council of Jamnia, which officially closed the canon of

---

[1] *The Old Testament "Minor Prophets" are: Hosea, Joel, Amos, Obadiah, Jonah, Micah, Nahum, Habakkuk, Zephaniah, Haggai, Zechariah, and Malachi.*

[2] *Steven L. McKenzie and Matt Patrick Graham (edit.), The Hebrew Bible Today: An Introduction to Critical Issues (Louisville, KY: Westminster John Knox Press, 1998), 95.*

the Jewish Bible and therefore it turned out to be a major feat in the history of the Bible.[1] The Jewish position reached in the first Jamnia Council was confirmed in yet another Jewish council, the second Jamnia Council, which met in CE 118. It was this act of the Jewish canonization of the Hebrew Scriptures that served as an analogy for the future course of Christian Church Fathers and later on the founders of the Reformation Movement in making their selection of the sacred writings for the canon of the Bible. Now let us look at the books of the Apocrypha.

The Old Testament's apocryphal books, in the broadest sense of the word, are roughly twelve—but not without a few additions and/or exceptions, depending on how one views them, that take the number to fifteen. All of these controversial *apocryphal* or *deuterocanonical* books of the Old Testament, including the ones bearing exceptions to the norm, are added to the following list:

1. Tobit
2. Judith
3. The additions to Esther
4. The Wisdom of Solomon
5. Ecclesiasticus (also called Sirach and the Wisdom of Jesus ben Sirach)
6. Baruch
7. The Letter of Jeremiah
8. The Prayer of Azariah and the Song of the Three Young Men
9. Susanna
10. Bel and the Dragon
11. First Maccabees
12. Second Maccabees
13. First Esdras (Third Esdras)
14. Second Esdras (Fourth Esdras)
15. The Prayer of Manasseh[2]

---

[1] *Beckwith, Old Testament Canon, 274.*

[2] *Lester L. Grabbe, An Introduction to Second Temple Judaism (New York, NY: T & T Clark, 2010), 33.*

Jerome of Stridon, the most well-known character in the history of the translation of the Bible, is again a figure of crucial importance in the dissemination of the Apocrypha in the Christian world. Jerome's *Vulgate*, the Latin Bible, includes the Apocrypha and is therefore the main source of preserving apocryphal literature for the subsequent biblical versions in the times to follow. The *Vulgate* was the Bible of Europe during the Dark Ages and was held so until the rise of the revolutionary spirits of Reformation and Humanism. Martin Luther's Bible was, in fact, first such edition of the Bible in centuries that included a separate section on the Apocrypha.[1] What Luther did was historically game-changing in that he put the books and texts not originally found in the Masoretic text of the Hebrew Bible between the two Testaments and removed them altogether from the original Old Testament.[2]

Ever since the time of Martin Luther, the Christian world subscribing to the Protestant religious thought have treated those books as non-canonical and therefore being rejected from the Bible. There has been no historical flexibility on this subject among the Protestants because their approach to determining the status of the scriptures reflects absolute conservatism. The institution of Papacy and the Councils of Catholic religion are, on the other hand, such key players that can crucially factor into the reformation and transformation of the evolving religious thought among the Roman Catholics. Since it is believed among the Catholics that the Papacy and the Church Council have divine will inherent in them, they can make modifications into the faith system within certain granted limits for the well-being of the believers.[3] It is, therefore, within the notion of justification to assume that their approach to the scriptural canonicity is not quite as conservative.

Why is the Apocrypha not the Bible?

The question, "Why is the apocrypha not the Bible?", is absolutely crucial for a study that attempts to address the problem of the presence of Apocrypha among other scriptures. Apparently, it is a theological question. However, it will be revealed

---

[1] H.H. Kramm, The Theology of Martin Luther (Eugene, Oregon: Wipf & Stock, 2009), 112.
[2] 1545 Edition of the Luther Bible (http://liederschatz.net/biblia/biblia2/)
[3] Richard F. Costigan, The Consensus of the Church and Papal Infallibility (Washington, DC: The Catholic University of America Press, 2005), 51.

upon a closer observation that it is more deeply rooted into the history and historicity of the biblical literature than in theology and metaphysical thought of the Christian religion. Any textual references, whether religious, literary or linguistic, all fall into the category of historical research when confronted with the posing question of the Apocrypha's controversial presence in the Bible.

While asserting the position that the Apocrypha is not part of the Bible, Christian scholars often cite an internal evidence from the Bible itself to support their argument.[1] This internal evidence is very "doctrinal" in nature, as Kramm maintains, which, quite surprisingly, offers an 'inspirational' testimony even before the historical testimony of the early Church.[2] We will explore this internal evidence in the coming pages, whereas at first we will look into the external evidence.

Biblical scholars cite various external pieces of evidence, whereof one particular reference comes from the Babylonian Talmud. It is quite interesting that the Talmud does not—neither the Jerusalem Talmud nor the Babylonian Talmud—directly make a mention of the Apocrypha as a section of the Bible, nor either of them alludes to any of its individual books separately. What the Babylonian Talmud does do in this context is, nevertheless, something to the contrary. It issues a verdict stating that the Holy Spirit of God, the divine agency responsible for the process of according revelation and inspiration to prophets in the Jewish religion, departed from the nation of Israel after the "latter prophets" and there was a complete void of divine communication with man through prophetic inspiration. In *Sot* 13:2, for instance, the Babylonian Talmud states the Rabbinic stance on the subject of inspiration accorded to Israel via the agency of the heavenly entity the Jews perceived of as the Holy Spirit:

When Haggai, Zechariah, and Malachi, the latter prophets, died, then the Holy Spirit departed from Israel. But even so, they made them hear [Heavenly messages] through an echo.[3]

---

[1] I will strictly and objectively follow the general line of argumentation in the Church while addressing the apocrypha question instead of trying to make a case for or against the Apocrypha.

[2] Kramm, Theology, 112-113.

[3] Robert Menzies, Empowered for Witness: The Spirit in Luke-Acts (New York, NY: T & T Clark International, 2004), 85.

The above citation is one of many such references from the Babylonian Talmud that makes the same assertion that the Holy Spirit departed from Israel after the disappearance of the last prophet, Malachi. In the Rabbinic Judaism's theological view, the period of four hundred years that elapsed between the last Jewish prophet and John the Baptist was an inspirational void, which brought the depravity of God's silence towards Israel. Such a notion indeed carries theological weight because it is established on the historical view of a religious community, the Rabbinic Judaism, which is engaged in dialogue with the circumstances at a given time—the inspirational gap between the two Testaments of the Bible—within a historical framework.[1]

Another important external evidence that appears to support the thesis that the Apocrypha is not inspired and therefore not a coherent part of the whole of biblical canon is the absence of apocryphal books from the Jewish canon. Historians from both Jewish and Christian camps have most frequently cited the same 24 (Jewish organization) and 39 (Christian organization) books of the Old Testament in early Judeo-Christian history—there are, of course, exceptions too. Josephus, for instance, is quite probably the most important historian to quote in this scenario for securing an external evidence of the extra-canonical status of the Apocrypha. He mentions 22 books of the Jews saying that 'there are not with us myriads of books, discordant and discrepant, but only twenty-two, comprising the history of all time, which are justly accredited.'[2] Josephus, surprisingly, relies on the apocryphal books for his own writings and does not render them as the "apocrypha" anywhere; instead, he uses a culturally imbued phrase "the books of our own country" to speak of the apocryphal writings being his extra-biblical source of the history of Jews.[3]

It may come as a surprise that the apocryphal writings survived from getting lost to time, primarily, due to the Christian preservation of them. The Jews cannot claim the credit of putting in serious efforts to the end of preserving the writings of

[1] *Timothy H. Lim, The Formation of the Jewish Canon (New Haven, CT: Yale University Press, 2013), 7.*
[2] *Martin Goodman, ed., The Apocrypha (Oxford, UK: Oxford University Press, 2001), 3.*
[3] *Louis H. Feldman, Josephus's Interpretation of the Bible (Berkley, CA: University of California Press, 1998), 51.*

the Apocrypha. As a matter of fact, the Jews were not interested in those books as "sacred writings," as it can be inferred from Josephus' treatment of the apocryphal books being a secular source. Christians, on the other hand, treated the apocryphal books with respect and added them to their Bible to be read and recited as scriptures in the Church.

Now we will take a look into the text of the Bible for exploring the internal evidence. The internal biblical evidence against the canonicity of the Apocrypha is substantial, manifold, and multifaceted. One very often used argument in this regard, for instance, is that the New Testament writers do not quote Jesus and/or the Apostles referencing the Old Testament through the so-called apocryphal books. Since the Christ and his Apostles profoundly cited the Old Testament during their ministries, it was but natural for them to draw from the Apocrypha if it had been held among Christ's inner circle as part of the received canon of the Hebrew Scriptures. Such an absence of the apocryphal texts from the epiphany of the New Testament leads to a conclusion that many would view as logical, namely the Apocrypha was not understood to be associated with the received Hebrew Bible in any justified way.[1]

Some of the early Church Fathers, to the contrary, did in fact quote the Apocrypha in their writings. The first and second books of Maccabees and additions to Daniel and Esther were included in the historic Greek translation of the Hebrew Bible, the *Septuagint*. Those Church Fathers from Alexandria and other Greek speaking Christian communities who were not learned in the Hebrew language were mainly responsible for citing sections from the apocryphal books that were found in the *Septuagint*.[2]

Another assertion against the Apocrypha, though more hypothetical and arbitrary in nature, is often made that the Old Testament books exhibit God intervening in the national history of Israel every now and then, whereas the apocryphal books lack such a technique of divine intervention in the writing style that

---

[1] *E. W., Outlines, 45-46.*
[2] *Elesha Coffman, "Why are Protestant and Catholic Bibles different?", Christianity Today, 8 August, 2008, Carol Stream, Illinois: Christianity Today International.*

might make a case for their scriptural status. It is not, however, recognized as a strong argument among critics to support that conclusion because biblical Book of Esther, as biblical scholars point out, also remains indifferent to the mention of the sacred name of God, *Yahweh*, translated into English as "Lord."[1]

In a broader scope of criticism, Christian scholars believe that the apocryphal books yield more secular goals than spiritual and theological and such is true on the account that they were only personal endeavors of certain individuals rather than an act of *inspiration* by the Holy Spirit. It is precisely the reason, therefore, why the apocryphal books cannot be included in the canon of the Scriptures.[2] This particular mindset is reflected in its fullest in the "Westminster Confession," where it reads as follows:

The Apocrypha are of no authority in the Church of God, nor to be any otherwise approved or made use of than other human writings.[3]

The above confessional statement clearly establishes that the Protestant Movement bases its findings about the Apocrypha on the fundamental belief that the Holy Spirit has no revelatory role in the writing of the Apocrypha. And since the Holy Spirit is the key-player in the writing process of the Bible, no books other than those inspired by the Holy Spirit can make into the canon of the Bible.

The Bible of the Catholic and the Orthodox Churches:

The versions of the Bible of both the Catholic and the Orthodox Churches carry various apocryphal books as part of the canon. The canons of the two churches, however, do not mutually agree on the exact number of the books in the Bible due to their conflicting understandings of the Apocrypha. Importantly, the New Testament canon is the same for both the Roman Catholic and the Orthodox Churches.

---

[1] *Michael V. Fox, Character and Ideology in the Book of Esther (Eugene, OR: Wipf and Stock Publishers, 1991), 115.*
[2] *E. W., Outlines, 45-46.*
[3] *E. W., Outlines, 45.*

The Orthodox Church takes lead over the Roman Catholic Church in terms of the number of books. The Greek Orthodox Church, for instance, accepts the books removed by the Jews from the Hebrew Bible and reads them as their sacred scripture. They recognize those books, nonetheless, as the 'proto-canonical' books and maintains a fine line of difference between the proto-canonical and the canonical books.[1] This raises the number of the Old Testament books in the Greek Orthodox canon from 39 to 51.

With the dispensation of this inquiry into further east within the Orthodox Church, the numerical difference does not remain strictly limited to the Old Testament, but it also extends to the New Testament. The Ethiopian Orthodox Church, for instance, recognizes a higher number of books in the canon of the New Testament. Interestingly, the number of books in the New Testament canon jumps up to 35 in the Ethiopian Orthodox Church.

The highest number of books altogether in a version of the Bible, therefore, belongs to the Ethiopian Orthodox Church. The total number of books in their Bible is 81—46 books of the Old Testament and 35 books of the New Testament. The books that are in addition to the 39 canonical books of the Old Testament are called the "narrow canon" in the Bible of the Ethiopian Orthodox Church.[2] The Catholic Bible, on the other hand, houses 73 books in its entirety—27 books of the canonical New Testament and 46 books of the Old Testament. Those additional books it contains within the Old Testament are *Tobit, Judith, 2 Maccabees, 2 Maccabees , Wisdom of Solomon, Baruch* (*Letters of Jeremiah*), *Ecclesiasticus* (*Sirach*), and additions to *Daniel* and *Esther*.[3]

The Protestant Church is the only group within the broader spectrum of Christian religion that rejects the Apocrypha altogether on the grounds discussed above. The Roman Catholic Church, on the other hand, holds a doctrinal position

---

[1] *Lee Martin McDonald, Formation of the Bible: Story of the Church's Canon (Peabody, MA: Hendrickson Publishers, 2012). 150.*

[2] *James H. Charlesworth, The Old Testament Pseudepigrapha, "Introduction" (Garden City, NY: Doubleday & Company Inc., 1983), xxiv.*

[3] *Elesha, "Why?", Christianity Today.*

between the Eastern Orthodox Church and the Protestant Churches. The criterion for the canonicity of the scriptures is not quite as strict in the Eastern Churches *per se*, whereas, the same criterion becomes extremely stringent in the eyes of reformed Christianity, Protestantism. The Eastern Orthodox Church does not grant authority to the Jewish act of erasing seven books from the Hebrew Bible and treats them as part of the historical evolution of biblical literature. Thus, they get on board with the Roman Catholic Church on this subject and invest their faith in the continuity of inspiration through the Apocrypha.

Bibliography

Beckwith, Roger T., *The Old Testament Canon of the New Testament Church.* Eugene, OR: Wipf and Stock Publishers, 1985.

Charlesworth, James H., *The Old Testament Pseudepigrapha*, Garden City, NY: Doubleday & Company Inc., 1983.

Charles, R.H., *The Apocrypha and Pseudepigrapha of the Old Testament,* Berkley, CA: The Apocryphile Press, 2004.

Coogan, Michael D., Marc Brettler, Carol Newsom, and Pheme Perkins, eds. *The New Oxford Annotated Apocrypha: New Revised Standard Version.* New York, NY: Oxford University Press, 2018.

Costigan, Richard F., *The Consensus of the Church and Papal Infallibility.* Washington, DC: The Catholic University of America Press, 2005.

Goodman, Martin, ed., *The Apocrypha.* Oxford, UK: Oxford University Press, 2001.

Feldman, Louis H., *Josephus's Interpretation of the Bible,* Berkley, CA: University of California Press, 1998.

Fox, Michael V., *Character and Ideology in the Book of Esther.* 2nd Ed. Eugene, OR: Wipf and Stock Publishers, 1991.

Grabbe, Lester L., *An Introduction to Second Temple Judaism*, New York, NY: T & T Clark, 2010.

Kramm, H.H., *The Theology of Martin Luther*, Eugene, Oregon: Wipf & Stock, 2009.

Lim, Timothy H., *The Formation of the Jewish Canon.* New Haven, CT: Yale University Press, 2013.

McDonald, Lee Martin, *Formation of the Bible: Story of the Church's Canon.* Peabody, MA: Hendrickson Publishers, 2012.

McKenzie, Steven L. and Matt Patrick Graham, ed., *The Hebrew Bible Today: An Introduction to Critical Issues*, Louisville, KY: Westminster John Knox Press, 1998.

Menzies, Robert, *Empowered for Witness: The Spirit in Luke-Acts,* New York, NY: T & T Clark International, 2004.

W., E.E., *Outlines of the Old Testament Study, Historical and Critical,* London, UK: Oxford, 1883.

Christianity Today

ماہانہ آنلائن **الاسلام ریئل** تحقیقی مجلہ

علوم اسلامیہ و عصری تعلیم۔ کالج، یونیورسٹی، اور فاضلین جامعات متوجہ ہوں

الاسلام ریئل کے آنے والے شمارے کے لیے اپنے مضامین/ مقالہ جات/ ریسرچ پیپر ارسال فرمائیں

ہمارا مقصد صرف اسلام کی طرف اٹھنے والے ہر فتنہ کا علمی جواب دینا ہے اور اس کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا پڑے گا۔

موضوعات۔ دفاع اسلام۔ دفاع قرآن۔ دفاع حدیث۔ ختم نبوت و ناموس رسالت۔ تقابل ادیان۔

رد الحاد۔ رد فتنہ جدیدیہ (غامدی، پرویزی، محمد شیخ)۔ اسلامی تاریخ۔ اسلامی سائنس۔ مغربیت اور عصر حاضر

آپ کے جو مضامین HEC کے جرنلز یا کسی بھی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں اور علمی نوعیت کے ہیں

تو براہ کرم آپ ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔ ایم فل، پی ایچ ڈی Assignments بھی بھیج سکتے ہیں۔

مضمون باحوالہ۔ فرقہ واریت۔ تعصب۔ طنز و فریب۔ سے پاک ہونا چاہیے۔

اگر آپ مدرس/ استاد ہیں اور اپنے طالبعلموں کو جو ریسرچ ورک دیتے ہیں، براہ کرم ان کی اجازت سے رسالہ میں شائع کروانے کی کوشش کریں۔

کسی بھی قسم کی علمی معاونت کے لیے "**الاسلام ریئل**" کی ٹیم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

 Magazine@AlislamReal.Org

 AlislamReal.Org

 03004907617

 03450580470